بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تفسیر سورۂ مریم

اٰیاتھا ۹۸ ۱۹ سورۃ مریم مکیۃ ۴۴ رکوعاتھا ۶

یہ بالاجماع مکی سورت ہے اور اس کی 98 آیات ہیں۔

جب جنگ بدر ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے اس میں کفار کے سرداروں کو قتل کر دیا تو کفار قریش نے کہا: تمہارا بدلہ حبشہ کی زمین میں ہے۔ نجاشی کی طرف جاؤ اور اس کی طرف اپنے دو صاحب رائے اور بھیجو شاید وہ تمہیں قریش کے وہ آدمی دے دے جو اس کے پاس ہیں۔ پھر تم اپنے بدر کے مقتولوں کے بدلے میں انہیں قتل کر دینا۔ کفار قریش نے عمرو بن عاص اور عبداللہ بن ابی ربیعہ کو بھیجا۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ان کے آدمی بھیجنے کے متعلق سنا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرو بن امیہ ضمری کو بھیجا اور اسے نجاشی کے لیے خط لکھ کر دیا۔ عمرو بن امیہ نجاشی کے پاس آیا اور اس نے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا خط پڑھا پھر جعفر بن ابی طالب اور مہاجرین کو بلایا اس نے راہبوں اور علماء کو بلایا اور انہیں جمع کیا پھر جعفر کو ان پر قرآن پڑھنے کو کہا تو انہوں نے سورۂ مریم، کٓھٰیٰعٓصٓ پڑھی اور لوگ اٹھے تو ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ ان لوگوں کے بارے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوا الْیَهُوْدَ وَ الَّذِیْنَ اَشْرَكُوْا ۚ وَ لَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوا الَّذِیْنَ قَالُوْۤا اِنَّا نَصٰرٰی ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّیْسِیْنَ وَ رُهْبَانًا وَّ اَنَّهُمْ لَا یَسْتَكْبِرُوْنَ ۝ وَ اِذَا سَمِعُوْا مَاۤ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰۤی اَعْیُنَهُمْ تَفِیْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ ۚ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَاۤ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِیْنَ ۝ (المائدہ) تلاوت کی۔ یہ ابوداؤد نے ذکر کیا ہے۔ سیرت میں نجاشی نے کہا: کیا تمہارے پاس وہ کلام ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم لائے ہیں؟ حضرت جعفر نے کہا: ہاں۔ نجاشی نے آپ کو کہا: وہ مجھ پر پڑھو۔ تو انہوں نے کٓھٰیٰعٓصٓ پڑھا تو وہ رونے لگا حتی کہ آنسوؤں سے اس کی داڑھی تر ہو گئی۔ اس کے علماء بھی رونے لگے حتی کہ ان کی داڑھیاں بھی تر ہو گئیں۔ جب انہوں نے وہ کلام سنا جو ان پر تلاوت کیا گیا تھا۔ نجاشی نے کہا: یہ وہ ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام لیکر آئے تھے۔ یہ ایک مشکاۃ سے نکلے ہیں۔ نجاشی بادشاہ نے عمرو بن عاص اور عبداللہ بن ابی ربیعہ کو کہا: تم دونوں چلے جاؤ اللہ کی قسم! یہ لوگ میں کبھی بھی تمہارے حوالے نہیں کروں گا۔ پھر مکمل خبر ذکر کی۔

كٓهٰیٰعٓصٓ ۝ ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ عَبْدَهٗ زَكَرِیَّا ۝ اِذْ نَادٰی رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِیًّا ۝ قَالَ رَبِّ اِنِّیْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّیْ وَ اشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَیْبًا وَّ لَمْ اَكُنْۢ بِدُعَآىِٕكَ رَبِّ شَقِیًّا ۝ وَ اِنِّیْ خِفْتُ الْمَوَالِیَ مِنْ وَّرَآءِیْ وَ كَانَتِ امْرَاَتِیْ عَاقِرًا فَهَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِیًّا ۝ یَّرِثُنِیْ وَ یَرِثُ مِنْ اٰلِ یَعْقُوْبَ ۖۗ وَ اجْعَلْهُ رَبِّ رَضِیًّا ۝ یٰزَكَرِیَّاۤ

اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمِ اسْمُهٗ يَحْيٰى لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا ﴿7﴾ قَالَ رَبِّ اَنّٰى
يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّكَانَتِ امْرَاَتِيْ عَاقِرًا وَّقَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا ﴿8﴾ قَالَ كَذٰلِكَ
قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ وَّقَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَكُ شَيْـًٔا ﴿9﴾ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ
لِّيْۤ اٰيَةً قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَيَالٍ سَوِيًّا ﴿10﴾ فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ مِنَ
الْمِحْرَابِ فَاَوْحٰۤى اِلَيْهِمْ اَنْ سَبِّحُوْا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا ﴿11﴾ يٰيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ
وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا ﴿12﴾ وَّحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَزَكٰوةً وَكَانَ تَقِيًّا ﴿13﴾ وَّبَرًّا بِوَالِدَيْهِ
وَلَمْ يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا ﴿14﴾ وَسَلٰمٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ يَمُوْتُ وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا ﴿15﴾

''کاف، ہا، یا، عین، ص۔ یہ ذکر ہے آپ کے رب کی رحمت کا جو اس نے اپنے بندے زکریا پر فرمائی جب اس نے پکارا اپنے رب کو چپکے چپکے۔ عرض کی: اے میرے رب! میری حالت یہ ہے کہ کمزور و بوسیدہ ہوگئیں میری ہڈیاں اور بالکل سفید ہوگیا ہے (میرا) سر بڑھاپے کی وجہ سے اور اب تک ایسا نہیں ہوا کہ میں نے تجھے پکارا ہو اے میرے رب! اور میں نامراد رہا ہوں۔ اور میں ڈرتا ہوں (اپنے دینی) رشتہ داروں سے (کہ وہ) میرے بعد (دین ضائع نہ کردیں) اور میری بیوی بانجھ ہے پس بخش دے مجھے اپنے پاس سے ایک وارث۔ جو وارث بنے میرا اور وارث بنے یعقوب علیہ السلام کے خاندان کا اور بنادے اسے اے رب! پسندیدہ (سیرت والا)۔ اے زکریا! ہم مژدہ دیتے ہیں تجھے ایک بچے (کی ولادت) کا اس کا نام یحییٰ ہوگا ہم نے نہیں بنایا اس کا کوئی ہم نام اس سے پہلے۔ زکریا نے عرض کی: میرے رب! کیسے ہوسکتا ہے میرے ہاں لڑکا حالانکہ میری بیوی بانجھ ہے اور میں خود پہنچ گیا ہوں بڑھاپے کی انتہا کو؟ فرمایا: یونہی ہوگا تیرے رب نے فرمایا ہے کہ اس کبرسنی میں بچہ دینا میرے لیے آسان بات ہے اور (دیکھو) میں نے تمہیں بھی تو پیدا کیا تھا اس سے پیشتر حالانکہ تم کچھ بھی نہ تھے۔ زکریا نے عرض کی: اے میرے رب! ٹھہرا دو میرے لیے کوئی علامت۔ جواب ملا تیری علامت یہ ہے کہ تو بات نہیں کرسکے گا لوگوں سے تین رات تک حالانکہ تو بالکل تندرست ہوگا۔ پھر آپ نکل کر آئے اپنی قوم کے پاس (اپنے) عبادت خانہ سے تو اشارہ سے انہیں سمجھایا کہ پاکی بیان کرو (اپنے رب کی) صبح و شام۔ اے یحییٰ! پکڑ تو کتاب کو مضبوطی سے اور ہم نے عطا فرمادی ان کو دانائی جبکہ وہ بچے تھے۔ نیز عطا فرمائی دل کی نرمی اپنی جناب سے اور نفس کی پاکیزگی اور وہ بڑے پرہیزگار تھے۔ اور وہ خدمت گزار تھے اپنے والدین کے اور وہ جابر اور سرکش نہ تھے۔ اور سلامتی ہو ان پر جس روز وہ پیدا ہوئے اور جس روز انتقال کریں گے اور جس روز انہیں اٹھایا جائے گا زندہ کرکے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: کٓھٰیٰعٓصٓ۔ حروف مقطعات پر کلام پہلے سورتوں کے آغاز میں گزر چکی ہے۔ حضرت ابن عباس

رضی اللہ عنہما نے فرمایا: کاف۔ کافی سے، ھا۔ ھادی ہے، یا۔ حکیم سے اور عین۔ علیم سے اور صاد۔ صادق سے ہے؛ یہ ابن العزیز نے ذکر کیا ہے۔ قشیری نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کے لیے کافی ہے اپنے بندوں کو ہدایت دینے والا ہے۔ اس کا ہاتھ سب کے ہاتھوں پر ہے (یعنی سب پر غالب ہے) ان کو جاننے والا ہے اپنے وعدہ میں سچا ہے۔ یہ قول ثعلبی نے کلبی، سدی، مجاہد اور ضحاک سے روایت کیا ہے۔ کلبی نے یہ بھی کہا ہے کہ الکاف، کریم، کبیر اور کافی سے۔ ھا، ھادی سے ہے۔ یا رحیم سے ہے۔ عین علیم اور عظیم سے ہے۔ صاد صادق سے ہے۔ معنی ایک ہی ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ایک اسم ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا اسم ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ اس طرح دعا مانگتے تھے: یا کٓھٰیٰعٓصٓ اغفرلی؛ یہ غزنوی نے ذکر کیا ہے۔ سدی نے کہا: یہ وہ اسم اعظم ہے جس کے ذریعے سوال کیا جائے تو اللہ تعالیٰ عطا فرماتا ہے اور جب اس کے ذریعے دعا مانگی جائے تو اللہ تعالیٰ دعا قبول فرماتا ہے۔ قتادہ نے کہا: یہ قرآن کے اسماء میں سے اسم ہے؛ یہ عبدالرزاق نے معمر سے اور انہوں نے قتادہ سے روایت کیا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ سورت کا نام ہے۔ قشیری کا اختیار یہی ہے (1) کہ حروف مقطعات سورتوں کے نام ہیں اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ کٓھٰیٰعٓصٓ پر کلام کا تمام ہے۔ گویا یہ سورت کے نام کے متعلق بتایا گیا ہے جیسے تو کہتا ہے: فلاں کتاب (طہارت) یا باب فلاں (وضو) پھر تو مقصد میں شروع ہوتا ہے۔ ابوجعفر نے ان حروف کو علیحدہ علیحدہ پڑھا ہے۔ اور باقی قراء نے وصل کیا ہے۔ ابوعمرو نے ھا میں امالہ کیا اور یاء کو فتح کے ساتھ پڑھا۔ ابن عامر اور حمزہ نے اس کے برعکس پڑھا ہے اور ان دونوں کو کسائی، ابوبکر اور خلف نے امالہ کیا ہے۔ اہل مدینہ، نافع وغیرہ نے ان دولفظوں کے درمیان پڑھا ہے اور باقی قراء نے دونوں کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ خارجہ سے مروی ہے کہ حسن کاف کو ضمہ دیتے تھے اور اس کے علاوہ سے حکایت ہے کہ انہوں نے ھا کو ضمہ دیا ہے۔ اسماعیل بن اسحاق نے حکایت کیا ہے کہ وہ یاء کو ضمہ دیتے تھے۔ ابوحاتم نے کہا: کاف کو ضمہ دینا اور ھا اور یا کو ضمہ دینا جائز نہیں۔ نحاس نے کہا: اہل مدینہ کی قرأت سب سے بہتر ہے اور ھا اور یا میں امالہ جائز ہے اور حسن کی قرأت جماعت قراء پر مشکل ہے حتیٰ کہ انہوں نے کہا: یہ جائز نہیں ہے، ان علماء میں سے ابوحاتم بھی ہیں اس کے بارے میں ہارون القاری نے بیان کیا ہے انہوں نے کہا: حسن رفع کو اشمام کرتے تھے، اس کا معنی ہے وہ اشارہ کرتے تھے جیسا کہ سیبویہ نے حکایت کیا ہے کہ عربوں میں سے بعض کہتے ہیں: الصلوۃ والزکاۃ یومی الی الواو۔ یعنی الصلوۃ اور الزکاۃ کے لفظ واؤ کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اور صاد کے ججے سے دال کو نافع، ابن کثیر، عاصم، اور یعقوب نے ظاہر کیا ہے؛ یہی ابوعبیدہ کا اختیار ہے اور باقی قراء نے اسے ادغام کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ عَبْدَهٗ زَكَرِيَّا ۚ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا ۝ اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ ذکر کے رفع میں تین اقوال ہیں۔ فراء نے کہا: یہ کٓھٰیٰعٓصٓ کی وجہ سے مرفوع ہے۔ زجاج نے کہا: یہ محال ہے کیونکہ کٓھٰیٰعٓصٓ اس میں سے نہیں ہے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ

1۔ تفسیر طبری، ج 16-15، صفحہ 54

نے ہمیں حضرت زکریا علیہ السلام کے متعلق خبر دی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں حضرت زکریا علیہ السلام اور انہیں جو بشارت دی اس کے متعلق خبر دی اور کٓھٰیٰعٓصٓ ان کے قصہ سے نہیں ہے۔ اخفش نے کہا: تقدیر عبارت اس طرح ہے فیما یقص علیکم ذکر رحمة ربك۔ اور بعض علماء نے فرمایا: حسن نے ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ پڑھا ہے، یعنی ھذا المتلو من القرآن ذکر رحمة ربك۔ اور ذَكِّرُ امر کا صیغہ پڑھا گیا ہے۔ اور رحمتہ لکھا جاتا ہے اور ھاء کے ساتھ اس پر وقف کیا جاتا ہے اسی طرح ہر اسم جو اس کی مثل ہوتا ہے اس کے ساتھ معاملہ کیا جاتا ہے۔ اس میں نحویوں کا کوئی اختلاف نہیں ہے اور اس میں انہوں نے یہ علت بیان کی ہے کہ یہ ھا اسماء کی تانیث کے لیے ہے تاکہ ان کے اور افعال کے درمیان فرق ہو جائے۔

مسئلہ نمبر 2۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: عَبْدَهٗ۔ اخفش نے کہا: یہ رحمۃ کی وجہ سے منصوب ہے اور زکریا اس سے بدل ہے جیسے تو کہتا ہے: ھذا ذکر ضرب زید عمرا عمراً ضرب کی وجہ سے منصوب ہے اسی طرح عبدہ، رحمة کی وجہ سے منصوب ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ تقدیم وتاخیر پر ہے اس کا معنی ہے ذکر ربك عبدہ زکریا، برحمتہ۔ پس عبدہ، ذکر کی وجہ سے منصوب ہے، زجاج اور فراء نے یہ ذکر کیا ہے۔ بعض علماء نے عبدہ زکریا رفع کے ساتھ پڑھا ہے یہ ابو العالیہ کی قرأت ہے۔ یحییٰ بن یعمر نے ذکر نصب کے ساتھ پڑھا ہے اس معنی پر کہ ھذا القرآن ذکر رحمة عبدہ زکریا۔ زکریا کے بارے میں قرات اور لغات سورۂ آل عمران میں گزر چکی ہیں۔

مسئلہ نمبر 3۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِیًّا ﴿۳﴾ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْیَةً ؕ اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ ﴿۵۵﴾ (الاعراف) یہ پہلے گزر چکا ہے۔ ندا کا معنی دُعا اور رغبت ہے یعنی انہوں محراب میں اس کے ساتھ اپنے رب سے مناجات کی، اس کی دلیل یہ اشارہ ہے: فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ هُوَ قَآئِمٌ یُّصَلِّیْ فِی الْمِحْرَابِ (آل عمران: 39) یہ ظاہر ہوا کہ ان کی نماز میں ہی دعا کی قبولیت ہوئی جیسا کہ انہوں نے نماز کے اندر دعا کی ان کی دعا کو مخفی کرنے کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض نے فرمایا: اپنی قوم سے اس دعا کو مخفی کیا تاکہ بڑھاپے میں بچے کے سوال پر انہیں ملامت نہ کی جائے۔ دوسرا یہ کہ یہ دنیوی امر تھا اگر اس کی دعا قبول کی گئی تو وہ اپنا مقصود پالیں گے اگر قبول نہ ہوگی تو اس کے متعلق کسی کو علم نہ ہوگا۔ بعض علماء نے فرمایا: اس دعا میں خلوص کا مظاہرہ کر رہے تھے جس پر اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی مطلع نہ تھا۔ بعض علماء نے فرمایا: کیونکہ خفیہ اعمال افضل ہوتے ہیں اور ریاکاری سے پاک ہوتے ہیں اس لیے انہوں نے دعا کو مخفی کیا۔ بعض علماء نے فرمایا: خفیا۔ کا مطلب ہے رات کی تاریکی میں اپنی قوم سے چھپا کر دعا کی یہ تمام احتمال موجود ہیں لیکن پہلا قول اظہر ہے۔

سورۂ اعراف میں گزر چکا ہے کہ دعا میں اخفا مستحب ہے اور یہ آیت اس میں نص ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت زکریا علیہ السلام کی اس پر تعریف فرمائی ہے۔ اسماعیل نے روایت کیا ہے فرمایا ہمیں مسدد نے بتایا فرمایا ہمیں یحییٰ بن سعید نے بتایا انہوں نے اسامہ بن زید سے روایت کیا انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کیا اور یہ ابن ابی کبشہ سے انہوں نے حضرت سعد بن ابی وقاص سے اور انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کیا ہے (1) فرمایا: ان خیر الذکر الخفی و خیر

1۔ مجمع الزوائد، جلد 10، صفحہ 85

الرزق مایکفی۔ بہتر ذکر خفی ہے اور بہتر رزق وہ ہے جو کفایت کرے۔ یہ عام ہے۔ یونس بن عبیدہ نے کہا: حضرت حسن کا نظریہ یہ ہے کہ امام دعا مانگے اور مقتدی بغیر بلند آواز کے آمین کہیں اور یونس نے تلاوت کی: اِذْ نَادٰی رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِیًّا۔ ابن عربی نے کہا: امام مالک نے دعا آہستہ کی اور امام شافعی نے اس میں جہر کیا۔ اور دعا میں جہر افضل ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جہراً دعا فرماتے تھے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالَ رَبِّ اِنِّیْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّیْ اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالَ رَبِّ اِنِّیْ وَهَنَ۔ وَهُنَ بھی پڑھا گیا ہے۔ اس کا مطلب ہے کمزور ہونا۔ کہا جاتا ہے: وَهَنَ یَهِنُ وَهْناً فهو واهنٌ۔ کمزور ہونا۔ ابوزید نے کہا: وَهَنَ یَهِنُ أو وَهِنَ یَوْهَنُ بھی کہا جاتا ہے۔ الْعَظْمُ کا ذکر کیا کیونکہ یہ بدن کا عمود ہے اس کے ساتھ جسم کا قوام ہے۔ یہ اس کی بنا (ڈھانچہ) کی اصل ہے جب ہڈیاں کمزور ہوتی ہیں تو جسم کی تمام قوتیں کمزور ہو جاتی ہے کیونکہ جسم میں ہڈی ہی سخت اور مضبوط ہوتی ہے جب ہڈیاں کمزور ہو جاتی ہیں تو دوسرا جسم بدرجہ اولیٰ کمزور ہو جاتا ہے۔ عظم واحد ذکر فرمایا کیونکہ واحد جنسیت کے معنی پر دلالت کرتا ہے۔ اس سے یہ قصد فرمایا کہ یہ وہ جنس ہے جو عمود اور قوام کا باعث ہے اور جسم جس سے مرکب ہوتا ہے اس میں سخت ترین یہ ہے اس کو بھی کمزوری لاحق ہو چکی ہے۔ اگر جمع ذکر کی جاتی تو دوسرے مفہوم کا ارادہ ہوتا اور وہ یہ ہے کہ اس سے بعض ہڈیاں کمزور نہیں ہوئیں لیکن اکثر کمزور ہوئی ہیں۔

مسئلہ نمبر 2۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَیْبًا۔ ابوعمرو نے سین کو شین میں ادغام کیا ہے۔ یہ عرب کلام میں خوبصورت ترین استعارہ ہے۔ الاشتعال کا معنی ہے آگ کی شعاع کا بکھرنا، اس کے ساتھ سر میں بڑھاپے کے پھیلنے کو تشبیہ دی گئی ہے، یعنی حضرت زکریا علیہ السلام نے کہا: میں کمزور اور بوڑھا ہو چکا ہوں۔ اشتعال کو بالوں کے پیدا ہونے کی جگہ کی طرف منسوب کیا اور وہ سر ہے۔ راس (سر) کو مضاف نہیں کیا کیونکہ مخاطب کو علم ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام کا سر مراد ہے۔ شَیْبًا اس کی نصب میں دو وجوہ ہیں۔ (۱) یہ مصدر ہے کیونکہ اشتعل کا معنی ہے شاب۔ یہ اخفش کا قول ہے اور زجاج نے کہا: یہ تمیز کی بنا پر منصوب ہے۔ نحاس نے کہا: اخفش کا قول اولیٰ ہے کیونکہ وہ فعل سے مشتق ہے پس مصدر بنانا اولیٰ ہے۔ الشیب کا معنی ہے سفید اور سیاہ بالوں کا ملنا۔

مسئلہ نمبر 3۔ ہمارے علماء نے فرمایا: انسان کے لیے مستحب ہے کہ اپنی دعا میں ان انعامات کو یاد کرے جو اللہ تعالیٰ نے اس پر کیے ہیں اور ایسی چیزوں کا ذکر کرے جو خضوع کے مناسب ہوں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ هَنَ الْعَظْمُ مِنِّیْ خضوع کا اظہار ہے اور وَّ لَمْ اَكُنْۢ بِدُعَآىِٕكَ رَبِّ شَقِیًّا۝ دعا قبول کرنے میں فضل کرنے کی عادات کا اظہار ہے یعنی تجھ سے دعا مانگنے میں کبھی شقی نہیں ہوا، یعنی جب بھی میں نے تجھ سے دعا مانگی تو میں دعا میں محروم نہیں رہا، یعنی تو نے مجھے دعا کی قبولیت کا عادی بنا دیا ہے۔ کہا جاتا ہے: شقی بکذا یعنی اس میں تھک گیا اور مقصود حاصل نہ ہوا۔ بعض علماء سے مروی ہے کہ محتاج نے اس سے سوال کیا اور کہا: میں وہ ہوں تو نے فلاں وقت میں اس سے احسان کیا تو اس نے کہا: خوش آمدید اسے جو ہمارے ذریعے ہم تک پہنچا اور پھر اس کی حاجت پوری کر دی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِنِّیْ خِفْتُ الْمَوَالِیَ مِنْ وَّرَآءِیْ وَ كَانَتِ امْرَاَتِیْ عَاقِرًا فَهَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِیًّا ۝ اس میں سات مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِنِّیْ خِفْتُ الْمَوَالِیَ حضرت عثمان بن عفان، محمد بن علی اور علی بن حسین اور یحییٰ بن یعمر رضی اللہ عنہم نے خَفَّت خا کے فتحہ اور فا کی شد اور تا کے کسرہ کے ساتھ اور الْمَوَالِیَ کو یا کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ خفت کی وجہ سے یہ محل رفع میں ہے۔ اس کا معنی ہے میرے رشتہ دار موت کے ساتھ ختم ہو گئے۔ اور باقی قراء نے خفت خاء کے کسرہ، فا کے سکون اور تا کے ضمہ اور موالی کے یا کی نصب کے ساتھ پڑھا ہے، کیونکہ خفت کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔ الْمَوَالِیَ سے یہاں مراد قریبی رشتہ دار ہیں۔ اور چچا کے بیٹے اور وہ عصبات ہیں جو نسب میں ان سے ملتے تھے۔ عرب چچا کے بیٹوں کو بھی الْمَوَالِیَ کہتے ہیں۔ شاعر نے کہا:

مَهْلاً بَنِي عَمِّنَا مَهْلاً مَوَالِينَا لَا تَنْبُشُوا بَيْنَنَا مَا كَانَ مَدْفُونَا

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، مجاہد اور قتادہ نے کہا: حضرت زکریا علیہ السلام کو اندیشہ ہوا کہ قریبی رشتہ دار وارث بنیں گے اور باپ اور بیٹے کے علاوہ وہ لوگ وارث بنیں گے۔ ایک جماعت نے کہا: آپ کے رشتہ دار دین کے لیے سستی کرنے والے تھے تو آپ کو اپنی موت سے دین کے ضیاع کا خوف ہوا، پس آپ نے ایسا ولی طلب کیا جو ان کے بعد دین کو قائم رکھے؛ یہ قول زجاج نے حکایت کیا ہے۔ اس قول کی بنا پر ہے کہ آپ نے مال کے وارث کا سوال نہیں کیا کیونکہ انبیاء میراث نہیں چھوڑتے۔ یہ قول آیت کی تاویل میں سے دونوں قول میں صحیح ہے، کیونکہ انہوں نے علم، نبوت کی وراثت کا ارادہ فرمایا تھا مال کی وراثت کا ارادہ نہیں فرمایا تھا، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ہم انبیاء کا گروہ میراث نہیں چھوڑتے جو ہم نے چھوڑا وہ صدقہ ہے" (1)۔ ابو داؤد کی کتاب میں ہے "علماء انبیاء کے ورثاء ہیں، انبیاء دینار و درہم کا وارث نہیں بناتے اور وہ علم کا وارث بناتے ہیں" (2)۔ اس کی مزید وضاحت یرثنی کے قول کے تحت آئے گی۔

مسئلہ نمبر 2۔ یہ حدیث مسند تفسیر میں داخل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ وَرِثَ سُلَیْمٰنُ دَاوٗدَ (النمل: 16) اور حضرت زکریا کے قول کو یوں تعبیر فرمایا: فَهَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِیًّا ۝ یَّرِثُنِیْ وَ یَرِثُ مِنْ اٰلِ یَعْقُوْبَ۔ اور اس میں عموم کی تخصیص ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام، حضرت داؤد علیہ السلام کے مال کے وارث نہ بنے تھے۔ اپنے بعد حضرت داؤد علیہ السلام نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو خلیفہ بنایا تھا اور اس سے حکمت و علم کے وارث ہوئے تھے، اسی طرح حضرت یحییٰ علیہ السلام آل یعقوب سے وارث ہوئے تھے۔ رافضیوں کے علاوہ مفسرین نے اس قرآنی آیت کی تفسیر میں یہی کہا ہے مگر حسن بصری سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: یَّرِثُنِیْ مال کا وارث بنے۔ وَ یَرِثُ مِنْ اٰلِ یَعْقُوْبَ نبوت و حکمت کا وارث بنے۔ ہر وہ قول جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کے مخالف ہو وہ مردود، مہجور ہے؛ یہ ابو عمر کا قول ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: مفسرین میں اکثر کا نظریہ یہ ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام نے مال کی وراثت کا ارادہ کیا ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

1۔ صحیح بخاری، کتاب الفرائض، جلد 2، صفحہ 995 2۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 996۔ ایضاً جامع ترمذی، باب ما جاء فی فضل الفقه على العبادة، حدیث 2606

کے قول: ''ہم انبیاء کا گروہ میراث نہیں چھوڑتے'' (1)۔ احتمال رکھتا ہے کہ آپ نے اس سے عموم مراد نہ لیا ہو بلکہ اس سے مراد غالب امر ہو۔ یہ مقام غور ہے۔ اظہر اور مناسب حضرت زکریا علیہ السلام کے لیے یہ ہے کہ انہوں نے وراثت علم اور دین مراد لی ہے۔ اس صورت میں وراثت، مستعارہ ہوگی کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا جب انہوں نے ولی طلب کیا ہے تو انہوں نے بچے کو خاص نہیں فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی امنگ کو کامل طور پر پورا فرمایا۔ ابو صالح وغیرہ نے کہا: مِنْ اٰلِ یَعْقُوْبَ سے مراد علم اور نبوت کی میراث ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مِنْ وَّرَآءِیْ ابن کثیر نے اسے مد اور ہمزہ اور یا کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ان سے مقصور اور یا کے فتحہ کے ساتھ پڑھنا بھی مروی ہے، جیسے عصایٰ اور باقی قراء نے ہمزہ، مد اور یا کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور قراء خفت کی قرأت پر ہیں جیسے بِنْتُ، مگر جو ہم نے عثمان سے ذکر کیا ہے یہ بہت شاذ قرأت ہے حتی کہ بعض علماء نے فرمایا: وہ جائز ہی نہیں ہے۔ فرمایا: وہ کیسے یہ کہتے ہوں گے: خَفَّت الموالی من بعدی؟ یعنی میرے وصال کے بعد، حالانکہ وہ زندہ تھے۔ نحاس نے کہا: اس کی تاویل ہو سکتی ہے کہ مِنْ وَّرَآءِیْ سے مراد من بعد موتی نہ ہو لیکن من ورائی فی ذالک الوقت ہو۔ یہ تاویل بھی بعید ہے اور دلیل کی محتاج ہے کہ وہ اس وقت کم تھے جبکہ اللہ تعالیٰ نے ان کی کثرت کی خبر دی ہے جب انہوں نے کہا: اَیُّهُمْ یَكْفُلُ مَرْیَمَ (آل عمران: 44)

ابن عطیہ نے کہا: مِنْ وَّرَآءِیْ کا مطلب ہے اس زمانہ میں میرے بعد (2) اور یہ بھی وراء ہے جیسا کہ سورۃ الکہف میں گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ كَانَتِ امْرَاَتِیْ عَاقِرًا آپ کی بیوی ایشاع بنت فاقوذ ابن قبیل تھی۔ یہ حنۃ بنت فاقوذ کی بہن تھی؛ یہ طبری کا قول ہے۔ حنہ یہ حضرت مریم علیہا السلام کی والدہ ہے جیسا کہ سورۂ آل عمران میں گزر چکا ہے۔ قتبی نے کہا: حضرت زکریا کی بیوی ایشاع بنت عمران تھی۔ اس قول کی بنا پر حضرت یحییٰ علیہ السلام کی خالہ کے بیٹے ہوں گے اور دوسرے قول کی بنا حضرت پر عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ کی خالہ کے بیٹے ہوں اور حدیث اسراء میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: فلقیت ابنی الخالۃ یحییٰ و عیسیٰ میں خالہ کے بیٹوں یحییٰ اور عیسیٰ سے ملا۔ یہ قول پہلے قول کا شاہد ہے۔ واللہ اعلم۔

العاقر اس عورت کو کہتے ہیں جو عمر کے زیادہ ہونے کی وجہ سے بچے جنم نہیں دیتی اس کا ذکر آل عمران میں ہو چکا ہے اور عورتوں میں عاقر اس کو بھی کہتے ہیں جو عمر کے زیادہ ہونے کے باوجود بھی بچے جنم نہیں دیتی اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ یَجْعَلُ مَنْ یَّشَآءُ عَقِیْمًا (الشوریٰ: 50)

اسی طرح مردوں میں سے بھی العاقر ہوتا ہے شاعر کا قول ہے:

لبئس الفتی إن کنتُ أعورَ عاقراً　　جبانا فما عُذْرِی لَدَی کُلِّ مَحْضَرِ

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب العلم، جلد 2، صفحہ 58-57۔ ایضاً 3157۔ سنن ابن ماجہ، باب فضل العلماء والحث علی طلب العلم، حدیث نمبر 218
2۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 5

مسئلہ نمبر 5۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَهَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۝ یہ سوال اور دعا ہے بیٹے کے لیے، صراحۃً دعا نہیں کی کیونکہ انہیں اپنی حالت بھی معلوم تھی اور عورت کے بارے بھی علم تھا۔ قتادہ نے کہا: ان کے لیے یہ امر جاری ہوا جبکہ عمر ستر سال سے زائد تھی۔ مقاتل نے کہا: پچہتر (75) سال تھی یہ زیادہ مناسب ہے۔ حضرت زکریا کا غالب گمان تھا کہ بڑھاپے کی وجہ سے ان کا بچہ پیدا نہ ہوگا اسی وجہ سے کہا: وَقَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا۔ ایک جماعت نے کہا: بلکہ انہوں نے بچہ طلب کیا(1) پھر اس بات کی قبولیت طلب کی کہ وہ زندہ رہے حتی کہ وہ وارث بنے، اس بات سے حفاظت کے لیے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ بچے کے بارے میں دُعا قبول ہو لیکن پھر وہ ختم ہو جائے اور اس سے غرض پوری نہ ہو۔

مسئلہ نمبر 6۔ علماء نے فرمایا: حضرت زکریا علیہ السلام نے بچے کے لیے دعا کی تا کہ ان کے دین کا غلبہ ہو اور ان کی نبوت کا احیا ہو اور ان کے اجر میں اضافہ ہو دنیا کی خاطر دعا نہیں کی تھی۔ رب کریم نے انہیں قبولیت کا عادی بنا دیا تھا اسی وجہ سے انہوں نے کہا: لَمْ اَكُنْۢ بِدُعَآىِٕكَ رَبِّ شَقِيًّا۔ یہ ایک اچھا وسیلہ ہے کہ انہوں نے اپنے اوپر نعمت کے وسیلہ سے سفارش طلب کی اور اس کے فضل کا، اس کے فضل کے وسیلہ سے سوال کیا۔

روایت ہے کہ حاتم طائی جو بہت سخی تھا اسے ایک شخص ملا اور اس نے اس سے سوال کیا۔ حاتم نے اسے کہا: تو کون ہے؟ اس نے کہا: میں وہ ہوں جس پر تو نے پہلے سال احسان کیا تھا۔ حاتم نے کہا: خوش آمدید جس نے ہماری بارگاہ میں ہمیں ہی شفیع بنایا۔ اگر یہ کہا جائے کہ حضرت زکریا علیہ السلام نے بغیر اذن کے خارق للعادت امر کا کیسے سوال کیا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ پہلے انبیاء کے زمانوں میں جائز تھا اور قرآن حکیم میں اس مفہوم کی وضاحت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ ۙ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ۚ قَالَ يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا ۭ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَاۗءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝ (آل عمران)

جب خارق للعادت امر کو دیکھا تو دُعا کی قبولیت میں ان کی امید مزید مستحکم ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ ۚ قَالَ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً (آل عمران: 38)

مسئلہ نمبر 7۔ اگر کوئی یہ کہے کہ یہ آیت بچے کے لیے دعا کرنے کے جواز پر دلالت کرتی ہے جبکہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اموال اور اولاد کی آفات سے ڈرایا ہے اور ان کے مفاسد پر تنبیہ کی ہے فرمایا: اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ (التغابن: 15) اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ (التغابن: 14) اس کا جواب یہ ہے کہ بچے کے لیے دعا کرنا کتاب و سنت سے ثابت ہے جیسا کہ اس کا بیان سورۂ آل عمران میں گزر چکا ہے۔ پھر حضرت زکریا علیہ السلام نے بری اولاد سے بچاؤ کیا۔ عرض کی: ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً (آل عمران: 38) اور کہا: وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيًّا۔

جب بچہ ان صفات کا حامل ہو تو دنیا و آخرت میں والدین کے لیے نفع بخش ہوتا ہے اور وہ عداوت اور فتنہ کی حد سے نکل جاتا ہے اور مسرت و نعمت کا باعث ہوتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خادم انس کے لیے دعا فرمائی: اللھم اکثر مالہ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 5

وولدہ وبارک لہ فیما اعطیتہ۔ (1) اے اللہ! اس کے مال اور اولاد میں کثرت فرما اور جو تو اسے عطا فرمائے اس میں برکت دے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے برکت کی دعا فرمائی تا کہ اس کثرت سے بچایا جائے جو ہلاکت کی طرف لے جاتی ہے۔ اسی وجہ سے بندے کو اپنے مولیٰ کی بارگاہ میں اپنی اولاد کی ہدایت اور دنیا وآخرت میں اس کی نجات کی دعا کرنی چاہیے تا کہ انبیاء علیہم السلام اور فضلاء و اولیاء کی اقتدا ہو جائے۔ اس کا بیان سورۂ آل عمران میں گزر چکا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یَّرِثُنِیْ وَ یَرِثُ مِنْ اٰلِ یَعْقُوْبَ ۖ وَ اجْعَلْهُ رَبِّ رَضِیًّا ۝ اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یَّرِثُنِیْ اہل حرمین، حسن، عاصم اور حمزہ نے یرثنی اور یرث دونوں کو رفع کے ساتھ پڑھا ہے۔ یحییٰ بن یعمر، ابو عمرو اور یحییٰ بن وثاب، اعمش اور کسائی نے دونوں کو جزم کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ دونوں ھب کا جواب نہیں ہیں، جیسا کہ سیبویہ کا مذہب ہے۔ اس کی تقدیر اس طرح ہے: ان تھبہ یرثنہ ویرث۔ معنی کے اعتبار سے پہلا قول زیادہ درست ہے کیونکہ انہوں نے موصوف وارث طلب کیا تھا یعنی تو مجھے ایسا ولی عطا فرما جو اس حالت اور صفت پر ہو کیونکہ ان میں بعض اولیاء وارث نہیں ہوتے۔ فرمایا: ھب لی الذی یکون وراثی۔ یعنی مجھے عطا فرما جو میرے پیچھے رہنے والا ہو؛ یہ ابو عبیدہ کا قول ہے اور جزم کی قراءت کا رد کیا ہے۔ فرمایا: اس کا معنی ہے اگر تو مجھے عطا فرمائے تو تو اسے وارث بھی بنا وہ کیسے اللہ تعالیٰ کو اس کے متعلق خبر دے رہا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ اس کے متعلق اس سے بہتر جانتا ہے۔ نحاس نے کہا: یہ مشہور حجت ہے کیونکہ نحویوں کے نزدیک جواب امر میں شرط اور جزا کا معنی ہوتا ہے تو کہتا ہے: اطع اللہ یدخلک الجنۃ۔ یعنی ان تطعہ یدخلک الجنۃ۔ اگر تو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرے گا تو وہ تجھے جنت میں داخل کرے گا۔

مسئلہ نمبر 2۔ نحاس نے کہا: یَّرِثُنِیْ وَ یَرِثُ مِنْ اٰلِ یَعْقُوْبَ کے معنی کے متعلق علماء کے تین جواب ہیں: بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد نبوت کی وراثت ہے۔ بعض نے فرمایا: حکمت کی وراثت ہے۔ بعض نے فرمایا: مال کی وراثت ہے۔ رہا ان کا قول کہ نبوت کی وراثت ہے یہ محال ہے کیونکہ نبوت میں میراث نہیں چلتی۔ اگر اس میں میراث ہوتی تو کہنے والا کہتا: لوگ حضرت نوح علیہ السلام کی طرف منسوب ہیں جبکہ وہ نبی مرسل ہے۔ اور علم و حکمت کی میراث کا قول عمدہ ہے۔ حدیث میں ہے: العلماء ورثۃ الانبیاء۔ علماء، انبیاء کے وارث ہیں۔ اور رہا مال کی وراثت کا قول تو یہ بھی ممتنع نہیں اگرچہ ایک جماعت نے اس کا انکار کیا ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: لانورث ماترکنا صدقۃ۔ ہم میراث نہیں چھوڑتے جو ہم نے چھوڑا وہ صدقہ ہے۔ اس میں کوئی حجت نہیں کیونکہ ایک اپنے متعلق جمع کی اخبار کے ساتھ خبر دے رہا ہے کبھی اس کی اس معنی کے ساتھ تاویل کی جاتی ہے۔ لانورث الذی ترکنا صدقۃ۔ کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی ایسی چیز پیچھے نہیں چھوڑی جو آپ کی طرف سے بطور میراث ہوتی اور یہ وہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے آپ کی زندگی میں آپ کے لیے اس قول: وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَ لِلرَّسُوْلِ (الانفال: 41) سے مباح فرمایا تھا کیونکہ لِلّٰهِ کا مطلب ہے سبیل اللہ۔ اور سبیل اللہ میں سے وہ تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مصلحت میں تھا جب تک آپ ظاہری حیات میں تھے۔ اگر یہ کہا جائے کہ بعض روایات میں ہے:

1۔ صحیح بخاری، کتاب الدعوات، قول اللہ تبارک و تعالیٰ وصل علیھم، جلد 2، صفحہ 938

انا معاشر الانبیاء لا نورث ما ترکنا صدقۃ۔ اس میں دو تاویلیں ہیں۔ ایک یہ ہے کہ ما بمعنی الذی ہے اور دوسرا یہ کہ جس کی یہ حالت ہو وہ میراث نہیں چھوڑتا۔ لا نورث ما ترکنا صدقۃ کی تاویل میں علماء کا اختلاف ہے۔ ایک قول یہ ہے اور یہ اکثر علماء اور جمہور علماء کا قول ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے میراث نہیں چھوڑی اور جو چھوڑا وہ صدقہ ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی میراث جاری نہیں ہوئی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ شان بخشی کہ آپ کا سارا مال صدقہ بنا دیا آپ کی فضیلت میں زیادتی کے لیے جیسا کہ نکاح میں، بعض چیز آپ کے لیے مباح کی گئی ہیں جبکہ وہ دوسرے لوگوں کے لیے حرام ہیں؛ یہ قول بعض اہل بصرہ کا ہے ان میں سے ایک ابن علیہ ہے اور باقی تمام علماء اسلام کا پہلا قول ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد یعقوب اسرائیل ہے۔ حضرت زکریا کی شادی مریم بنت عمران کی بہن سے ہوئی تھی اور اس کا نسب حضرت یعقوب علیہ السلام کی طرف لوٹتا ہے کیونکہ وہ حضرت سلیمان بن داؤد کی اولاد سے تھی اور وہ یہودا بن یعقوب کی اولاد سے تھے۔ اور حضرت زکریا علیہ السلام ہارون کی اولاد سے تھے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بھائی تھے۔ حضرت ہارون اور حضرت موسیٰ، لاوی بن یعقوب کی اولاد سے تھے۔ اور نبوت یعقوب بن اسحاق کی اولاد میں تھی۔ بعض علماء نے فرمایا: یہاں یعقوب سے مراد یعقوب بن ماتان ہے جو عمران بن ماتان کا بھائی تھا اور عمران حضرت مریم کا والد تھا۔ یہ دونوں حضرت سلیمان بن داؤد علیہما السلام کی نسل سے دونوں بھائی تھے، کیونکہ یعقوب اور عمران، ماتان کے بیٹے تھے اور بنو ماتان بنی اسرائیل کے رؤسا تھے؛ یہ مقاتل وغیرہ کا قول ہے۔ کلبی نے کہا: آل یعقوب آپ کے ماموں تھے اور وہ یعقوب بن ماتان تھے اور ان میں بادشاہت تھی اور حضرت زکریا علیہ السلام حضرت ہارون بن عمران کی اولاد سے تھے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بھائی تھے۔ قتادہ نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یرحم اللہ تعالیٰ زکریا ما کان علیہ من ورثتہ۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت زکریا علیہ السلام پر رحم فرمایا اس وجہ سے جو ان پر ان کے ورثاء کی طرف سے تھا۔ یعقوب غیر منصرف ہے کیونکہ عجمہ ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيًّا ۞ یعنی جس کے اخلاق اور افعال میں پسندیدگی ہو۔ بعض نے فرمایا: جو تیری قضاء وقدرت پر راضی ہو۔ بعض نے فرمایا: جو ایسا نیک ہو جس سے تو خوش ہو۔ ابو صالح نے کہا: اسے ایسا نبی بنا جیسے تو نے اس کے باپ کو نبی بنایا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يٰزَكَرِيَّآ اس کلام میں حذف ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی اور پھر فرمایا: يٰزَكَرِيَّآ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمِ اسْمُهٗ يَحْيٰى یہ بشارت (1) تین چیزوں کو اپنے ضمن میں لیے ہوئے ہے۔ (۱) ایک دعا کی قبولیت اور یہ ایک کرامت وعزت ہے۔ (۲) اسے بچہ عطا کرنا اور وہ قوۃ ہے۔ (۳) اس نام کے ساتھ ان کا منفرد ہونا۔ سورۂ آل عمران میں یحییٰ نام رکھنے کا معنی گزر چکا ہے۔ مقاتل نے کہا: ان کا نام یحییٰ رکھا کیونکہ وہ بوڑھے باپ اور بوڑھی ماں کے درمیان زندہ ہوئے۔ اس میں نظر ہے کیونکہ پہلے گزر چکا ہے کہ ان کی بیوی بانجھ تھی بچے جنم نہیں دیتی تھی واللہ اعلم۔

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 356

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا۝ ہم نے یحییٰ سے پہلے کسی کا یہ نام نہیں رکھا (1)؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، قتادہ ابن اسلم اور سدی کا قول ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر احسان فرمایا کہ کسی کے والدین کو یہ نام رکھنے کی توفیق نہیں دی؛ یہ مجاہد وغیرہ کا قول ہے۔ سَمِيًّا اس کا معنی مثل اور نظیر ہے۔ یہ گویا المساماۃ اور السمو سے مشتق ہے۔ اس میں بعد ہے کیونکہ حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ پر انہیں فضیلت نہیں ہے مگر یہ کہ کسی خاص صفت میں فضیلت دی گئی ہو جیسے سرداری اور عورتوں سے اجتناب وغیرہ جیسا کہ سورۂ آل عمران میں اس کا بیان گزر چکا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس کا معنی ہے بانجھ عورتوں نے اس کی مثل بچہ جنم نہیں دیا (2)۔ بعض علماء نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے قبل (پہلے) کی شرط لگائی کیونکہ ان کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان سے افضل پیدا کرنے کا ارادہ فرمایا تھا اور وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے۔ اس آیت میں دلیل ہے کہ اچھے ناموں کا اثر ہوتا ہے۔ عرب اچھے نام رکھنے کی کوشش کرتے تھے کیونکہ وہ عار اور شرم دلانے سے زیادہ پاک ہوتے ہیں حتیٰ کہ شاعر نے کہا:

سُنُّمُ الأَسامِي مُسْبِلِي أُزُرٍ　حُمْرٍ تَمَسُّ الأَرضَ بِالهُدُبِ

رؤبہ نے نسابہ بکری کو کہا جبکہ اس نے اس کا نسب پوچھا تھا: أنا ابن العجاج میں ابن العجاج ہوں۔ تو اس نے کہا: قَصَّرْتَ وعَرَّفْتَ۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ۔ یہ انکار کے معنی میں نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کی خبر دی ہے بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے تعجب کی بنا پر ہے کہ وہ بانجھ عورت اور بوڑھے آدمی سے بچہ پیدا کرے گا۔ بعض علماء نے اس کے علاوہ بھی اقوال کہے ہیں جن کا بیان سورۂ آل عمران میں ہو چکا ہے۔ وَّقَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا۔ یعنی بڑھاپے، خشکی کی انتہاء کو پہنچ چکا ہوں ان کی مثل العسی ہے۔ اصمعی نے کہا: عسا الشئ یعسو عسوا وعساء کا معنی ہے خشک ہونا اور سخت ہونا۔ وقد عسا الشیخ یعسو عُسِیا۔ اس کا معنی ہے پیٹھ پھیرنا حد سے بڑھنا جیسے عتا ہے۔ کہا جاتا ہے: عتا الشیخ یعتو عُتیا وعِتیا۔ اس کا معنی ہے وہ حد سے بڑھ گیا، پیٹھ پھیر گیا۔ عتوت یافلان تعتو عتواً وعِتیا۔ اس کی اصل عتو ہے کیونکہ یہ واوی ہے پھر واو کو یاء سے بدلا گیا ہے کیونکہ وہ اس سے زیادہ خفیف ہے اور تمام آیات یاء پر ختم ہو رہی ہیں اور جنہوں نے عِتیا کہا ہے انہوں نے کسرہ اور یاء کے ساتھ ضمہ کو ناپسند کیا ہے۔ شاعر نے کہا:

انما يُعْذَرُ الْوَلِيدُ ولايُعْ　ذَرُ مَنْ كان في الزَّمانِ عِتِيَّا

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے عُسِیا پڑھا ہے۔ اسی طرح ابی کے مصحف میں ہے۔ یحییٰ بن وثاب، حمزہ، کسائی اور حفص نے عتیا عین کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اسی طرح جثیا اور صلیا ہیں۔ جہاں بھی آئے ہیں۔ حفص نے بُکیا، کو ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اسی طرح باقی قراء نے تمام میں ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ دونوں لغتیں ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: عتیا قسیا کے معنی میں ہے، کہا جاتا ہے: ملک عاتٍ جب بادشاہ سخت دل ہو۔

1۔ تفسیر طبری، ج 16-15، صفحہ 60　2۔ ایضاً، ج 16-15، صفحہ 59

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالَ كَذٰلِكَ ۚ قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ یعنی فرشتے نے حضرت زکریا علیہ السلام سے یہ کہا۔ کَ محل رفع میں ہے یعنی الامر کذالک، یعنی معاملہ ایسا ہی ہے جیسا تجھے کہا گیا ہے۔ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ۔ فراء نے کہا: اس کا مطلب ہے مجھ پر اس کی تخلیق آسان ہے۔ وَقَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ یعنی یحییٰ سے پہلے میں نے تجھے پیدا کیا تھا؛ یہ اہل مدینہ، بصرہ اور عاصم کی قرأت ہے۔ تمام کوفیوں نے وقد خلقناک پڑھا ہے۔ نا جمع تعظیم کے لیے ہے۔ پہلی قرأت کلام کے زیادہ مناسب ہے۔

وَلَمْ تَكُ شَيْئًا ۝ یعنی اللہ تعالیٰ نے تجھے جس طرح عدم کے بعد پیدا کیا جبکہ تو موجود نہ تھا، وہ یحییٰ کی تخلیق اور ایجاد پر بھی قادر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً۔ ملائکہ کے بشارت دینے کے بعد اور وَقَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَكُ شَيْئًا کے قول کے بعد طمانیت میں زیادتی کے لیے نشانی طلب کی یعنی میرے لیے کوئی نشانی بنا کر نعمت کو مکمل کر۔ یہ نشانی نعمت وکرامت کی زیادتی ہوگی۔ بعض علماء نے فرمایا: آپ نے نشانی طلب کی جو اس بات پر دلالت کرے کہ بشارت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے شیطان کی طرف سے نہیں ہے کیونکہ ابلیس نے ان کو وہم میں ڈالا تھا؛ یہ ضحاک کا قول ہے۔ سدی کے قول کا بھی یہی معنی ہے۔ اس قول میں نظر ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ ملائکہ نے انہیں آواز دی جیسا کہ آل عمران میں گزر چکا ہے۔

قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَيَالٍ سَوِيًّا ۝ اس کا بیان بھی آل عمران میں گزر چکا ہے۔ اعادہ کی ضرورت نہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ مِنَ الْمِحْرَابِ یعنی اپنی عبادت گاہ سے ان کی طرف جھانکا ہے۔ محراب بلند جگہ اور معزز مجلس ہوتی ہے۔ لوگ عبادت گاہیں زمین سے اونچی بناتے تھے۔ اس کی دلیل حضرت داؤد علیہ السلام کی محراب ہے جیسا کہ آگے آئے گا۔ لوگوں کا اس کے اشتقاق میں اختلاف ہے۔ بعض علماء نے کہا: یہ الحرب سے مشتق ہے گویا اس میں ہمیشہ رہنے والا شیطان اور شہوات سے جنگ کرتا ہے۔ ایک جماعت نے کہا: الحرب (راء کے فتحہ کے ساتھ) سے مشتق ہے گویا عبادت خانہ میں رہنے والا تھکن اور مشقت اٹھاتا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ یہ آیت دلیل ہے کہ امام کا مقتدیوں سے بلند ہونا ان کے نزدیک مشروع تھا۔ اس مسئلہ میں فقہاء الامصار کا اختلاف ہے۔ امام احمد بن حنبل وغیرہ نے اس کو جائز قرار دیا ہے اور انہوں نے منبر والے واقعہ سے دلیل پکڑی ہے۔ امام مالک نے زیادہ اونچا ہونے سے منع کیا ہے، تھوڑا اونچا ہونے سے نہیں منع کیا۔ اور ان کے اصحاب نے منع کی دلیل یہ پیش کی ہے کہ امام پر تکبر کا اندیشہ ہوگا۔

میں کہتا ہوں: اس میں نظر ہے اس میں بہتر وہ ہے جو ابوداؤد نے ہمام سے روایت کیا ہے(1) کہ حذیفہ نے مدائن میں لوگوں کی امامت دکان پر کرائی تو ابومسعود نے ان کی قمیص سے پکڑ کر انہیں کھینچا۔ جب وہ نماز سے فارغ ہوئے تو انہوں نے کہا: کیا تم نہیں جانتے کہ لوگوں کو اس طرح کرنے سے روکا گیا ہے؟ حذیفہ نے کہا: ہاں۔ مجھے اس وقت یاد آیا جب تو نے مجھے کھینچا۔ اور عدی بن ثابت انصاری سے روایت کیا ہے فرمایا: مجھے ایک شخص نے بیان کیا کہ وہ حضرت عمار بن یاسر کے ساتھ مدائن میں تھا۔ نماز کے لیے تکبیر کہی گئی تو عمار بن یاسر آگے بڑھے اور دکان پر کھڑے ہو کر نماز پڑھنے لگے جبکہ لوگ نیچے

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، الامام یکون مکان ارفع من مکان القوم، جلد 1، صفحہ 88

تھے۔ حضرت حذیفہ آگے بڑھے اور ان کے ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ حضرت عمار ان کے پیچھے پیچھے چلتے آئے حتی کہ حضرت حذیفہ نے انہیں اتار لیا۔ جب عمار نماز سے فارغ ہوئے تو حضرت حذیفہ نے انہیں کہا: کیا تم نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے نہیں سنا: ''جب کوئی شخص قوم کی امامت کرائے تو ان کی جگہ سے بلند جگہ پر کھڑے نہ ہو(1)'' یا اسی جیسے کلمات فرمائے۔ حضرت عمار نے کہا: اسی وجہ سے میں تمہارے پیچھے پیچھے چلتا آیا جب تو نے میرے ہاتھوں کو پکڑا۔

میں کہتا ہوں: ان تینوں صحابہ نے بلند جگہ پر کھڑے ہونے کے بارے میں نہی کی خبر دی ہے۔ اور کسی نے حدیث منبر سے حجت نہیں پکڑی، تو یہ دلیل ہے کہ یہ حدیث منسوخ ہے۔ اور اس کے نسخ پر دلیل یہ ہے کہ اس میں عمل زائد ہے اور وہ منبر سے اترنا اور چڑھنا ہے پس یہ منسوخ ہے۔ جس طرح نماز میں کلام اور سلام منسوخ ہیں۔ یہ اولیٰ ہے اس سے ہمارے اصحاب نے دلیل پیش کی ہے کہ نبی کریم ﷺ تکبر سے محفوظ تھے، نیز بہت سے آئمہ ایسے ہوتے ہیں جن میں کبر نہیں ہوتا۔ ان میں سے بعض نے یہ علت بیان کی ہے کہ منبر کی بلندی تھوڑی تھی۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 3۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاَوْحٰۤى اِلَیْهِمْ اَنْ سَبِّحُوْا بُكْرَةً وَّ عَشِیًّا۝ کلبی، قتادہ اور ابن منبہ نے کہا: اس نے ان کی طرف اشارہ کیا ہے(2)۔ قتبی نے کہا: اس نے اشارہ کیا۔ مجاہد نے کہا: اس نے زمین پر لکھا۔ عکرمہ نے کہا: کتاب میں کئی کتب۔ کلام عرب میں وحی کا مطلب لکھنا ہے۔ اسی سے ذوالرمۃ کا قول ہے:

سوى الأربع الدُّهْم اللواتي كأنها　　بقيّةُ وَحْيٍ في بطونِ الصحائف

عنترہ نے کہا ہے:

كوحيِ صحائف من عهد كسرى　　فأهداها لأعجم طِمْطِمِيّ

ان دونوں اشعار میں وحی بمعنی کتابت استعمال ہوئی ہے۔

بُكْرَةً وَّ عَشِیًّا دونوں ظرف ہیں۔ فراء نے کہا: العشی مؤنث ہے اور اس کی تذکیر جائز ہے جب تو اسے مبہم کرے۔ اس نے کہا: کبھی العشی، عشیۃ کی جمع ہوتا ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ سورۂ آل عمران میں اشارہ میں حکم گزر چکا ہے۔ ہمارے علماء کا اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ کوئی کہے: میں فلاں سے کلام نہیں کروں گا، پھر اس کی طرف تحریر لکھ دے یا کوئی پیغام رساں بھیج دے۔ امام مالک نے فرمایا: ایسا کرنے سے وہ حانث ہو جائے گا مگر یہ کہ اس نے بالمشافہ گفتگو کرنے کی نیت کی ہو۔ پھر رجوع کیا اور فرمایا: تحریر میں نیت نہ ہوگی اور وہ حانث ہو جائے گا مگر یہ کہ خط پہنچنے سے پہلے واپس لے لے۔ ابن القاسم نے کہا: جب وہ اس تحریر کو پڑھے گا تو حانث ہو جائے گا۔ اسی طرح اگر قسم اٹھانے والا محلوف علیہ (جس کے متعلق قسم اٹھائی گئی تھی) کی تحریر پڑھے تو بھی یہی حکم ہے۔ اشہب نے کہا: جب قسم اٹھانے والا اسے پڑھے گا تو حانث (قسم توڑنے والا) نہ ہوگا۔ یہ واضح ہے کیونکہ اس نے کلام

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، الامام یکون مکان ارفع من مکان القوم، جلد 1، صفحہ 88

2۔ تفسیر طبری، جز 16-15، صفحہ 64

نہیں کی اور نہ کلام سے ابتدا کی مگر یہ کہ اس نے یہ ارادہ کیا ہو کہ وہ اس کی کلام کا معنی نہیں جانے گا تو اس صورت میں حانث ہو جائے گا۔ ابن القاسم کا قول اس پر محمول ہو گا اگر قسم اٹھائے کہ وہ ضرور اس سے کلام کرے گا پھر تو وہ اپنی قسم کو پورا نہیں کر سکے گا حتیٰ کہ بالمشافہ گفتگو کرے۔ ابن الماجشون نے کہا: اگر یہ قسم اٹھائے کہ اگر اس نے جانا تو وہ اسے سکھائے گا یا اسے خبر دے گا پھر اس نے اسے لکھ کر بھیج دیا یا کوئی پیغام رسان بھیج دیا تو وہ قسم پوری کرنے والا ہو گا۔ اور اگر دونوں نے اسے سکھایا تو قسم پوری کرنے والا نہیں ہو گا حتیٰ کہ وہ اسے سکھائے کیونکہ ان دونوں کا علم مختلف ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ امام مالک، امام شافعی اور کوفیوں کا اتفاق ہے گونگا جب اپنے ہاتھ سے طلاق لکھے گا تو طلاق لازم ہو جائے گی۔ کوفیوں نے کہا: مگر کوئی شخص کئی دن بہرہ کیا گیا ہو پھر اس نے طلاق لکھی تو اس سے کوئی چیز جائز نہ ہو گی۔ طحاوی نے کہا: گونگا، عارضی بہرے پن کے مخالف ہے جیسا کہ مرض کی وجہ سے ایک دن جماع سے عارضی عاجز شخص کا حکم جماع سے ہمیشہ مایوس شخص کے حکم کے مخالف ہے، جیسا کہ جدائی میں عورت کے خیار کے باب میں مجنون کا حکم ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **یٰیَحْیٰی خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ** اس کلام میں حذف ہے معنی یہ ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام کا بچہ ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے اس مولود (یحیی) کو کہا: **یٰیَحْیٰی خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ**۔ یہ اختصار ہے جس پر کلام دلالت کر رہی ہے۔ **الْكِتٰبَ** سے مراد تورات ہے۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ **بِقُوَّةٍ** سے مراد کوشش اور اجتہاد ہے؛ یہ مجاہد کا قول ہے(1)۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے اس کا علم حاصل کرنا، اس کو یاد کرنا اور اس پر عمل کرنا ہے۔ اور یہ عمل کرنا ہے اس کے اوامر کا التزام ہے اور نواہی سے رکنا ہے؛ یہ زید بن اسلم کا قول ہے۔ سورۂ بقرہ میں یہ گزر چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَ اٰتَیْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِیًّا ۝** بعض علماء نے فرمایا: **الْحُكْمَ** سے مراد احکام اور ان کی معرفت ہے۔ معمر نے روایت کیا ہے کہ بچوں نے یحییٰ سے کہا: ہمارے ساتھ چلو ہم کھیلیں گے۔ انہوں نے کہا: میں کھیل کے لیے پیدا نہیں کیا گیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد نازل فرمایا: **وَ اٰتَیْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِیًّا**۔ قتادہ نے کہا: آپ اس وقت دو یا تین سال کے تھے۔ مقاتل نے کہا: آپ تین سال کے تھے۔ صبیا پر نصب حال کی بنا پر ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: جس نے بالغ ہونے سے پہلے قرآن پڑھا وہ وہ ہے جسے بچپن میں حکم عطا کیا گیا(2)۔ اس آیت کی تفسیر میں حضرت عبداللہ بن عمر کے طریق سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے فرمایا: "قیامت کے روز آدم علیہ السلام کا ہر بیٹا آئے گا اور اس پر گناہ ہو گا سوائے یحییٰ بن زکریا علیہ السلام کے"۔ قتادہ نے کہا: حضرت یحییٰ علیہ السلام نے کبھی اللہ تعالیٰ کی کوئی چھوٹی اور بڑی نافرمانی نہیں کی (3)۔ اور نہ آپ کو کسی عورت کا خیال آیا۔ مجاہد نے کہا: حضرت یحییٰ علیہ السلام کا کھانا، گھاس تھا۔ اس کے رخساروں پر آنسوؤں کے لیے گزرگاہیں بنی ہوئی تھیں۔ وسیداً وحصوراً کا معنی سورۂ آل عمران میں گزر چکا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَّ حَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا**، **حَنَانًا**، کا عطف الحکم پر ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا: اللہ کی قسم! میں نہیں جانتا کہ الحنان کیا ہے(4)۔ جمہور مفسرین نے کہا: الحنان کا مطلب شفقت، الرحمۃ اور

1۔ تفسیر طبری، جز 16-15، صفحہ 65　　2۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 7

3۔ ایضاً، جلد 4، صفحہ 8　　4۔ تفسیر طبری، جز 16-15، صفحہ 67

المحبة ہے اور یہ نفس کے افعال میں سے ایک فعل ہے۔ نحاس نے کہا: الحنان کے معنی میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے دو قول مروی ہیں (۱) فرمایا: اللہ تعالیٰ کا رحمت کے ساتھ ان پر مہربانی فرمانا (۲) اور دوسرا قول یہ ہے کہ جو اس نے لوگوں پر رحمت فرمائی حتی کہ انہیں کفر و شرک سے نکالا (1)۔ اس کی اصل حنین الناقة علی ولدھا یعنی اونٹنی کا اپنے بچے پر انتہائی مہربان ہونا، کہا جاتا ہے: حنانك وحنانيك بعض علماء نے فرمایا: یہ دونوں لغتیں ہیں اور معنی ایک ہے۔ بعض نے فرمایا: حنانيك، الحنان کا تثنیہ ہے　ابوعبیدہ نے کہا: عرب کہتے ہیں: حنانك يا رب وحنانيك يا رب، دونوں کا معنی ایک ہے، مراد رحمت ہے۔ امرء القیس نے کہا:

وَيَمْنَحُهَا بَنُو شَمَجَى بن جَرْمٍ　مَعِيزَ هُمُ حَنَانَكَ ذَا الحَنَانِ

اور طرفہ نے کہا:

أبا مُنْذِرٍ أفْنَيْتَ فاسْتَبْقِ بَعْضَنا　حَنَانَيْكَ بعضُ الشَّرِّ أهْوَنُ مِنْ بَعْضِ

زمخشری نے کہا: حنانا، اپنے والدین وغیرہما کے لیے رحمت و مہربانی اور شفقت کا مظاہرہ کرنا ہے۔ سیبویہ نے یہ شعر کہا:

فقالتْ حَنَانٌ ما أتَى بك ها هُنا　أذُو نَسَبٍ أم أنتَ بالحَيِّ عارِفُ

ابن الاعرابی نے کہا: الحنان، اللہ تعالیٰ کی صفت ہے نون مشدد کے ساتھ ہو تو اس کا معنی الرحیم ہے اور نون مخفف ہو تو اس کا معنی مہربانی کرنا اور رحمت ہے۔ الحنان کا معنی رزق اور برکت بھی ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: عرب کلام میں اللہ تعالیٰ کی ذات کے بارے میں بڑے امر کو بھی کہتے ہیں اسی سے زید بن عمرو بن نفیل کا قول حدیث بلال میں ہے: اللہ کی قسم! اگر تم اس غلام کو قتل کر دو گے تو میں اس پر رحم کروں گا۔ اس خبر کو ہروی نے ذکر کیا ہے انہوں نے کہا: حدیث بلال میں ہے ورقہ بن نوفل حضرت بلال کے پاس سے گزرے جبکہ انہیں عذاب دیا جا رہا تھا تو ورقہ نے کہا: واللہ لئن قتلتلم لأتخذنه حناناً۔ ہروی نے کہا: اس کا معنی ہے میں اس پر مہربانی کروں گا اور اس پر رحم کروں گا کیونکہ یہ اہل جنت سے ہے۔

میں کہتا ہوں: الحنان کا معنی العطف ہے۔ اسی طرح مجاہد نے کہا: اور حنانا ہمارا اس کی طرف مائل ہونا یا اس کا مخلوق کی طرف کرم فرمانا ہے۔ حطیہ نے کہا:

تَحَنَّنْ عليَّ هَدَاكَ المليكُ　فإنَّ لكلِّ مقامٍ مَقَالَا

عکرمہ نے کہا: اس کا معنی محبت ہے۔ حنة الرجل امرأته، کہا جاتا ہے، دونوں کی آپس میں محبت کی وجہ سے۔ شاعر نے کہا:

فقالت حَنَانٌ ماأتَى بك هنانا　أذُو نَسَبٍ أمْ أنتَ بالحَيِّ عارِفُ

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَزَكٰوةً، الزکاة کا معنی تطہیر، برکت اور خیر اور نیکی میں زیادتی کرنا ہے، یعنی ہم نے اسے لوگوں کے لیے برکت والا بنا دیا ہے، وہ لوگوں کو ہدایت دیتا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے ہم نے اس کی تعریف کے ساتھ اس کا تزکیہ کیا ہے، جس طرح گواہ کسی انسان کا تزکیہ کرتے ہیں۔ پس بعض علماء نے فرمایا: زَكٰوةً کا مطلب ہے اس

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 7

کے والدین پر اس کو صدقہ کیا: یہ ابن قتیبہ کا قول ہے۔ وَ کَانَ تَقِیًّا یعنی وہ اللہ تعالیٰ کا اطاعت کرنے والا ہے۔ اس وجہ سے انہوں نے کوئی خطا کی اور نہ کبھی انہیں ایسا خیال آیا۔ اللہ کا ارشاد ہے: وَّ بَرًّۢا بِوَالِدَیْهِ، البر بمعنی البار ہے۔ نیکی کو فروغ دینے والا۔ جَبَّارًا، متکبر۔ یہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کی نرمی اور تواضع کے اوصاف ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ سَلٰمٌ عَلَیْهِ یَوْمَ وُلِدَ طبری وغیرہ نے کہا(1): اس کا معنی ہے امان۔ ابن عطیہ نے کہا: میرے نزدیک اظہر یہ ہے کہ یہ متعارف سلام ہے(2)۔ یہ امان سے زیادہ اشرف و معزز مقام ہے کیونکہ امان کو ان کے لیے ان سے عصیان کی نفی سے بھی حاصل ہوتی ہے اور یہ کم درجہ ہے اور شرف اس میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر سلام بھیجا اور اسے ایسے موقع پر زندہ رکھا جہاں انسان حد درجہ ضعیف و کمزور اور حاجت میں ہوتا ہے اور حیلہ کم ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی عظیم قوت کی طرف محتاج ہوتا ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ عمدہ قول ہے ہم نے اس کا معنی سورۂ سبحان میں حضرت یحییٰ علیہ السلام کے قتل کے بیان میں سفیان بن عیینہ سے ذکر کیا ہے۔ طبری نے حسن سے روایت کیا ہے کہ حضرت عیسیٰ اور حضرت یحییٰ علیہما السلام آپس میں ملے وہ دونوں خالہ زاد بھائی تھے۔ حضرت یحییٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کہا: آپ اللہ تعالیٰ سے میرے لیے دعا کریں آپ مجھ سے بہتر ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے انہیں کہا: آپ میرے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کریں آپ مجھ سے بہتر ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تجھ پر سلام بھیجا ہے اور میں نے اپنے اوپر خود سلام بھیجا ہے۔ بعض علماء نے سلام کرنے میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی فضیلت کا مسئلہ نکالا ہے فرمایا: انہوں نے اپنے اوپر سلام کرنے میں اور اللہ کی بارگاہ میں اپنی قدر و منزلت میں راہنمائی کی ہے، جو منزلت ثابت ہے جب اللہ تعالیٰ نے اس کو ثابت کیا۔ اور قرآن حکیم میں سلام کیے جانے سے زیادہ بلند مرتبہ حکایت کیا گیا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: ہر ایک کی ایک وجہ ہے(3)۔

وَ اذْكُرْ فِی الْكِتٰبِ مَرْیَمَ ۘ اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِیًّا ۝۱۶ فَاتَّخَذَتْ مِنْ
دُوْنِهِمْ حِجَابًا ۫ فَاَرْسَلْنَاۤ اِلَیْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِیًّا ۝۱۷ قَالَتْ اِنِّیْۤ اَعُوْذُ
بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ اِنْ كُنْتَ تَقِیًّا ۝۱۸ قَالَ اِنَّمَاۤ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ ۖۗ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا
زَكِیًّا ۝۱۹ قَالَتْ اَنّٰى یَكُوْنُ لِیْ غُلٰمٌ وَّ لَمْ یَمْسَسْنِیْ بَشَرٌ وَّ لَمْ اَكُ بَغِیًّا ۝۲۰ قَالَ كَذٰلِكِ ۚ
قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَیَّ هَیِّنٌ ۚ وَ لِنَجْعَلَهٗۤ اٰیَةً لِّلنَّاسِ وَ رَحْمَةً مِّنَّا ۚ وَ كَانَ اَمْرًا مَّقْضِیًّا ۝۲۱
فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَانًا قَصِیًّا ۝۲۲ فَاَجَآءَهَا الْمَخَاضُ اِلٰى جِذْعِ النَّخْلَةِ ۚ قَالَتْ
یٰلَیْتَنِیْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَ كُنْتُ نَسْیًا مَّنْسِیًّا ۝۲۳ فَنَادٰىهَا مِنْ تَحْتِهَاۤ اَلَّا تَحْزَنِیْ قَدْ
جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِیًّا ۝۲۴ وَ هُزِّیْۤ اِلَیْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَیْكِ رُطَبًا

1۔ تفسیر طبری، جز 16-15، صفحہ 69	2۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 8	3۔ ایضاً

جَنِيًّا ۝ فَكُلِىْ وَاشْرَبِىْ وَقَرِّىْ عَيْنًا ۚ فَاِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ الْبَشَرِ اَحَدًا ۙ فَقُوْلِىْۤ اِنِّىْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا فَلَنْ اُكَلِّمَ الْيَوْمَ اِنْسِيًّا ۝

''اور (اے حبیب!) بیان کیجئے کتاب میں مریم (کا حال) جب وہ الگ ہوگئی اپنے گھر والوں سے ایک مکان میں جو مشرق کی جانب تھا۔ پس بنالیا اس نے لوگوں کی طرف سے ایک پردہ پھر ہم نے بھیجا اس کی طرف اپنے جبرائیل کو پس وہ ظاہر ہوا اس کے سامنے ایک تندرست انسان کی صورت میں۔ مریم بولیں: میں پناہ مانگتی ہوں رحمن کی تجھ سے اگر تو پرہیزگار ہے۔ جبرئیل نے کہا: میں تو تیرے رب کا بھیجا ہوا ہوں تاکہ میں عطا کروں تجھے ایک پاکیزہ فرزند۔ مریم (حیرت سے) بولیں (اے بندہ خدا) کیونکر ہوسکتا ہے میرے ہاں بچہ حالانکہ نہیں چھوا مجھے کسی بشر نے اور نہ میں بدچلن ہوں۔ جبرئیل نے کہا: یہ درست ہے (لیکن) تیرے رب نے فرمایا: یوں بچہ دینا میرے لیے معمولی بات ہے اور (مقصد یہ ہے کہ) ہم بنالیں اسے اپنی (قدرت کی) نشانی لوگوں کے لیے اور سراپا رحمت اپنی طرف سے اور یہ ایسی بات ہے جس کا فیصلہ ہوچکا ہے۔ پس وہ حاملہ ہوگئیں اس (بچہ) سے پھر وہ گئیں اسے (شکم میں) لیے کسی دور جگہ۔ پس لے آیا انہیں دردِ زہ ایک کھجور کے تنے کے پاس (بصد حسرت و یاس) کہنے لگیں: کاش! میں مرگئی ہوتی اس سے پہلے اور بالکل فراموش کردی گئی ہوتی۔ پس پکارا اسے ایک فرشتہ نے اس کے نیچے سے: (اے مریم!) غمزدہ نہ ہو جاری کردی ہے تیرے رب نے تیرے نیچے ایک ندی۔ اور ہلاؤ اپنی طرف کھجور کے تنے کو گرنے لگیں گی تم پر پکی ہوئی کھجوریں (میٹھے میٹھے خرمے) کھاؤ اور (ٹھنڈا پانی) پیو اور (اپنے فرزند دلبند کو دیکھ کر) آنکھیں ٹھنڈی کرو پھر اگر تم دیکھو کسی آدمی کو تو (اشارہ سے اسے) کہو کہ میں نے نذر مانی ہوئی ہے رحمن کے لیے (خاموشی کی) روزہ کی پس میں آج کسی انسان سے گفتگو نہیں کروں گی''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاذْكُرْ فِى الْكِتٰبِ مَرْيَمَ یہ قصہ کی ابتدا ہے اس کا پہلے واقعہ سے تعلق نہیں اور خطاب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے، یعنی دور ہوگئی۔ النبذ کا معنی پھینکنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَنَبَذُوْهُ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ (آل عمران: 187) مِنْ اَهْلِهَا، یعنی ان سے جو آپ کے ساتھ تھے۔ اذ، مریم سے بدل اشتمال ہے کیونکہ اوقات اس پر مشتمل ہوتے ہیں جو ان میں ہوتا ہے۔ الانتباذ کا معنی جدا ہونا اور علیحدہ ہونا ہے۔ علماء کا اختلاف ہے کہ حضرت مریم کیوں جدا ہوئیں؟ سدی نے کہا: وہ علیحدہ ہوئیں تاکہ حیض اور نفاس سے پاک ہوجائیں۔ دوسرے علماء نے کہا: تاکہ اللہ کی عبادت کریں۔ یہ قول عمدہ ہے۔ حضرت مریم عبادت خانہ کی خدمت اور اس میں عبادت کرنے پر وقف تھیں اسی لیے وہ لوگوں سے جدا ہوئیں اور مشرقی جانب محراب میں داخل ہوئیں تاکہ خلوت میں عبادت کریں تو ان کے پاس جبرئیل آئے۔ مَكَانًا شَرْقِيًّا، مشرقی جانب کی جگہ۔ الشرق راء کے سکون کے ساتھ اس مکان کو کہتے ہیں جس میں سورج کی دھوپ پڑتی ہے۔ الشرق راء کے فتحہ کے ساتھ ہو تو اس سے مراد سورج ہوتا ہے۔ مشرقی مکان کو خاص کیا گیا ہے کیونکہ وہ مشرقی جہت کی تعظیم کرتے تھے اور اس وجہ سے کہ انوار طلوع ہوتے تھے۔ اور جہات شرقیہ ہر چیز سے افضل تھیں: یہ طبری نے حکایت کیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے

حکایت کیا گیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: میں لوگوں سے زیادہ جانتا ہوں (1) کہ نصاریٰ نے مشرق کو کیوں قبلہ بنایا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا ۝ پس انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کی جگہ کی جہت کو قبلہ بنا لیا وہ کہتے تھے: اگر زمین کی کوئی جہت مشرق سے بہتر ہوتی تو حضرت مریم علیہا السلام حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اس جہت میں جنم دیتیں۔

علماء کا حضرت مریم کی نبوت کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض نے فرمایا: اس ارسال اور فرشتے سے گفتگو کی وجہ سے نبیہ تھیں۔ بعض نے فرمایا: نبیہ نہیں تھیں انسان کی مثال نے ان سے کلام کیا تھا اور ان کا فرشتے کو دیکھنا ایسے ہی تھا جیسے جبرئیل کو دحیہ کلبی کی صفت میں دیکھا گیا تھا جب انہوں نے ایمان اور اسلام کے بارے میں سوال کیا تھا۔ پہلا قول اظہر ہے اس مفہوم پر کلام سورۂ آل عمران میں گزر چکا ہے۔ والحمد للہ۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاَرْسَلْنَاۤ اِلَيْهَا رُوْحَنَا بعض علماء نے فرمایا: وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی روح تھی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے روحوں کو اجساد سے پہلے پیدا فرمایا تھا اور حضرت عیسیٰ کا جسم جو حضرت مریم کے پیٹ میں اللہ تعالیٰ نے تخلیق کیا تھا اس میں روح پھونکی۔ بعض علماء نے فرمایا: وہ جبرئیل علیہ السلام ہیں۔ روح کو اللہ کی طرف تخصیص اور کرامت کے لیے مضاف کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے یہ جبرئیل علیہ السلام تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَتَمَثَّلَ لَهَا یعنی فرشتہ مریم کے لیے انسانی شکل میں آیا۔ بَشَرًا تفسیر یا حال ہے۔ سَوِيًّا متوازا خلقت والا، چونکہ حضرت مریم، جبریل کو اصلی شکل میں دیکھنے کی طاقت نہیں رکھتی تھیں۔ اس لیے انسانی شکل میں آئے۔ جب حضرت مریم نے انسانی شکل میں ایک خوبصورت انسان دیکھا جس نے آپ پر قائم پردہ کو ہٹایا (اور اندر آ گیا) تھا تو آپ نے خیال کیا کہ یہ کوئی برائی کا ارادہ رکھتا ہے۔ قَالَتْ اِنِّیْۤ اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ اِنْ كُنْتَ تَقِيًّا ۝ یعنی میں تجھ سے اللہ کی پناہ مانگتی ہوں اگر تو ان لوگوں میں سے ہے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں۔ بکالی نے کہا: جبرئیل امین رحمن کے ذکر سے گھبرا کر پیچھے ہٹے۔ ثعلبی نے کہا: وہ نیک شخص تھا تو حضرت مریم نے تعجب کی بنا پر پناہ مانگی۔ بعض نے فرمایا: تقی فعیل بمعنی مفعول ہے، یعنی تو ان لوگوں سے ہے جن سے بچا جاتا ہے۔ بخاری میں ہے ابو وائل نے کہا: مریم علیہا السلام جانتی تھیں کہ متقی عقلمند ہوتا ہے جب انہوں نے کہا: اِنْ كُنْتَ تَقِيًّا بعض نے فرمایا: تقی اس وقت میں معروف فاجر شخص کا نام ہے؛ یہ وہب بن منبہ کا قول ہے، مکی وغیرہ نے اس حکایت کیا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ قول ضعیف ہے اندازہ سے قول کیا گیا ہے (2)۔ جبرئیل نے حضرت مریم سے کہا: اِنَّمَاۤ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ ۖ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا ۝ عطا کرنے کی نسبت جبریل نے اپنی طرف کی کیونکہ اس عطیہ کی آگاہی جبریل کی طرف سے تھی۔ ورش نے نافع سے روایت کر کے لیہب لک پڑھا ہے۔ اس مفہوم پر کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے بھیجا ہے تا کہ وہ تجھے عطا کرے۔ بعض علماء نے فرمایا: لاهب اپنے معنی پر محمول ہے یعنی فرمایا میں نے اسے بھیجا تا کہ میں تجھے عطا کروں۔ اور اهب بغیر ہمزہ کے ہو تو احتمال رکھتا ہے کہ یہ بمعنی مہموز ہو پھر ہمزہ میں تخفیف کی گئی ہو جب حضرت مریم نے اس کے قول سے یہ سنا تو استفہام کے طریق پر کہا: قَالَتْ اَنّٰى

1۔ تفسیر طبری، جز 16-15، صفحہ 71 2۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 9

یَكُوْنُ لِیْ غُلٰمٌ وَّ لَمْ یَمْسَسْنِیْ بَشَرٌ یعنی مجھ سے کسی کا نکاح نہیں ہوا، وَّ لَمْ اَكُ بَغِیًّا۝ میں زانیہ نہیں ہوں۔ یہ آپ نے بطور تاکید ذکر کیا کیونکہ، لَمْ یَمْسَسْنِیْ بَشَرٌ کا قول حلال اور حرام کو شامل ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: حضرت مریم نے اللہ کی قدرت سے کسی چیز کو بعید نہیں سمجھا لیکن انہوں نے یہ ارادہ کیا کہ بچہ کیسے پیدا کیا؟ یہ مستقبل میں خاوند کی طرف سے پیدا ہوگا یا اللہ تعالیٰ ابتداءً اسے پیدا فرمائے گا؟ روایت ہے کہ جبریل نے جب حضرت مریم سے یہ بات کی تو آپ نے آپ کی قمیص کے گریبان میں اور آستین میں پھونک ماردی؛ یہ ابن جریج کا قول ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: جبریل نے قمیص کی کشادہ جگہ کو اپنی انگلیوں سے پکڑا اور اس میں پھونک ماردی۔ پس حضرت مریم اسی وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ حاملہ ہوگئیں۔ طبری نے کہا: نصاریٰ نے کہا حضرت مریم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ حاملہ ہوئیں تو ان کی عمر تیرہ سال تھی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اٹھائے جانے تک بتیس سال اور کچھ دن باقی رہے اور حضرت مریم ان کے اٹھائے جانے کے بعد چھ سال باقی رہیں۔ حضرت مریم کی کل عمر پچاس سال سے کچھ زائد تھی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لِنَجْعَلَهٗۤ یہ محذوف کے متعلق ہے یعنی نخلقه لنجعله، ہم اسے تخلیق کریں گے تاکہ اسے اپنی عجیب قدرت کی نشانی بنادیں۔ رَحْمَةً اور اس کے لیے رحمت بنادیں جوان پر ایمان لائے۔ وَ كَانَ اَمْرًا مَّقْضِیًّا۝ لوح محفوظ میں یہ مقدار اور مسطور ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَانًا قَصِیًّا۝ یعنی وہ حمل کے ساتھ دور کے مکان میں جدا ہوگئی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: وادی کے دور کنارے پر یہ بیت لحم کی وادی ہے (1)۔ اس کے اور ایلیاء کے درمیان چار میل کا فاصلہ ہے وہ اس لیے دور چلی گئی تھیں کہ قوم انہیں عار دلائے گی کہ بغیر خاوند کے بچہ جنم دیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ کوئی لمبا عرصہ نہیں ہوا تھا پس وہ حاملہ ہوئی تھیں اور اسی وقت جنم دیا تھا، یہ ظاہر ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حمل کے بعد پھینکنے کا ذکر کیا ہے۔ بعض نے اس کے علاوہ قول کیا ہے جیسا کہ آگے آئے گا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاَجَآءَهَا الْمَخَاضُ اِلٰى جِذْعِ النَّخْلَةِ، اجاءها کا معنی ہے اس نے اسے مجبور کرلیا (2)۔ جاء کو ہمزہ کے ساتھ متعدی بنایا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے: جاء به وأجاءه إلى موضع كذا، جیسے کہا جاتا ہے: ذهب به واذهبه، شبیل، اور رویت نے عاصم سے فَاَجَآءَهَا مفاجات سے مشتق کرکے پڑھا ہے۔ زہیر نے کہا:

وجَارٍ سَارَ معتمداً إلينا اَجَاءَتْهُ المخَافَةُ والرَّجَاءُ

جمہور علماء نے الْمَخَاضُ میم کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابن کثیر سے مروی ہے کہ انہوں نے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ الْمَخَاضُ سے مراد دردزہ ہے۔ مخضت المرأة تمخض مَخاضا ومِخاضاً۔ ناقة ماخض، ایسی اونٹنی جس کے بچے کی پیدائش قریب ہو۔ اِلٰى جِذْعِ النَّخْلَةِ، گویا اس نے ایسی چیز طلب کی جس کے ساتھ سہارا لے اور اس سے متعلق ہو جیسے حاملہ عورت درد کی شدت کی وجہ سے کسی چیز کو پکڑتی ہے۔ الجذع، کھجور کے خشک تنا کو کہتے ہیں جو صحرا میں ہو اور اس پر پتے نہ ہوں اور نہ ٹہنی ہو اسی وجہ سے الی النخلة نہیں فرمایا۔ قَالَتْ یٰلَیْتَنِیْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا حضرت مریم نے دین کی جہت سے دو

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 10
2۔ ایضاً

وجوہ کی بنا پر موت کی تمنا کی۔ ۱۔ انہیں خوف ہوا کہ اس کے متعلق ان کے دین میں شر کا گمان کیا جائے گا اور عار دلائی جائے گی اور یہ چیز اسے فتنہ میں ڈال دے گی۔ ۲۔ تاکہ قوم ان کے سبب بہتان اور زنا کی طرف نسبت کرنے میں مبتلا نہ ہو کیونکہ یہ چیز مہلک ہے اس حد پر موت کی تمنا جائز ہے۔ یہ معنی سورۂ یوسف میں گزر چکا ہے۔

میں کہتا ہوں: میں نے سنا ہے کہ حضرت مریم علیہا السلام نے ایک شخص کی آواز سنی جو کہہ رہا تھا نکل جائے وہ جس کی اللہ تعالیٰ کے علاوہ عبادت کی جاتی ہے تو آپ اس وجہ سے پریشان ہوئیں۔ قَالَتْ يٰلَيْتَنِيْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَ كُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا ۝ کلام عرب میں النسی کا معنی وہ حقیر شی ہے جس کی شان یہ ہو کہ وہ بھلائی جائے اور اس کے گم ہونے سے پریشانی نہ ہو جیسے کیل اور رسی جو مسافر کے پاس ہوتے ہیں۔ یہ عربوں سے حکایت ہے کہ وہ جب ایک منزل سے کوچ کرنے کا ارادہ کرتے تھے تو کہتے تھے: احفظوا أنساء کم۔ النساء، نسی کی جمع ہے اس سے مراد وہ حقیر چیز ہے جس سے غفلت کی جائے اور بھلائی جائے۔ اسی سے کیت کا قول ہے:

أتجعلنا جِسْرًا لكلب قُضاعةٌ ولسْتُ بِنِسْيٍ فی مَعَدٍّ ولا دَخْلِ

فراء نے کہا: النسی سے مراد وہ چیتھڑے ہیں جو عورت حیض کے خون سے طوث کر کے پھینک دیتی ہے۔ نسیا نون کے فتحہ کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔ یہ دونوں لغتیں ہیں جیسے الحَجراور الحِجر، الوَتراور الوِتر، محمد بن کعب قرظی نے ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ نسئاً، اور نون کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ نوف بکالی نے نسئاً نون کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ انہوں نے نساء اللہ تعالیٰ فی أجله سے مشتق کیا ہے جس کا معنی ہے اللہ نے اس کی عمر میں تاخیر فرمائی۔ یہ ابوالفتح اور دانی نے محمد بن کعب سے حکایت کیا ہے۔ بکر بن حبیب نے نسّا، سین کی شد اور نون کے فتحہ کے ساتھ بغیر ہمزہ کے پڑھا ہے۔ طبری نے حضرت مریم کے قصص میں حکایت کیا ہے کہ جب حضرت مریم، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ حاملہ ہوئیں تو ان کی بہن حضرت یحییٰ کے ساتھ حاملہ ہوئیں۔ حضرت یحییٰ کی والدہ ان کی زیارت کے لیے آئی تو حضرت مریم نے اسے کہا: کیا تجھے معلوم ہے کہ میں حاملہ ہوگئی ہوں۔ آپ کی بہن نے کہا: میں محسوس کرتی ہوں کہ جو میرے پیٹ میں ہے وہ اسے سجدہ کر رہا ہے جو تمہارے پیٹ میں ہے۔ یہ اس طرح ہے کہ روایت ہے کہ اس نے اپنے جنین (پیٹ کا بچہ) کو محسوس کیا کہ وہ حضرت مریم کے بطن کی طرف اپنا سر جھکا رہا ہے۔ سدی نے کہا: اس ارشاد سے یہی مراد ہے۔ مُصَدِّقًۢا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ سَيِّدًا وَّ حَصُوْرًا وَّ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ (آل عمران) ان کے قصص میں طبری نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ حضرت مریم بنی اسرائیل کے ایک شخص کے ساتھ بھاگ گئی تھیں اسے یوسف نجار کہا جاتا تھا وہ بھی حضرت مریم کے ساتھ مسجد کی خدمت کرتا تھا (1)۔ انہوں نے اس میں بڑی طویل گفتگو کی ہے۔ کلبی نے کہا: یوسف کو کہا گیا کہ مریم زنا کی وجہ سے حاملہ ہوئی ہے (نعوذ باللہ من ذالك القول) ابھی فرشتہ نے اسے قتل کرنے کا ارادہ کیا تو جبرئیل امین یوسف کے پاس آئے اور کہا: یہ روح القدس سے ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ تمام واقعات ضعیف ہیں۔ یہ قرآنی واقعہ تقاضا کرتا ہے کہ حضرت مریم حاملہ ہوئیں

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 10

اور وہ عورتوں کے عرف پر حاملہ رہیں۔ روایات ایک دوسری کی تائید کرتی ہیں کہ انہوں نے آٹھ ماہ کے بعد بچہ جنم دیا؛ یہ عکرمہ کا قول ہے اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ آٹھ ماہ کا بچہ زندہ نہیں رہتا تا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خصوصیت باقی رہے۔ بعض علماء نے فرمایا: انہوں نے نو ماہ کے بعد بچہ جنم دیا، بعض نے کہا: چھ ماہ بعد جنم دیا۔ جو ہم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے وہ اصح اور اظہر ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَنَادٰىهَا مِنْ تَحْتِهَآ، یہ میم کے فتحہ اور کسرہ کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: مَنْ سے مراد جبرئیل ہے (1) اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کلام نہ کی حتی کہ حضرت مریم اسے قوم کے پاس لے آئیں یہ علقمہ، ضحاک اور قتادہ کا قول ہے۔ اس میں حضرت مریم کے لیے نشانی اور علامت تھی کہ اللہ تعالیٰ کے خارق للعادت امور میں کوئی مقصد عظیم ہوتا ہے۔ اَلَّا تَحْزَنِيْ، یہ ندا کی تفسیر ہے اور ان مفسرہ بمعنی ای ہے معنی ہے کہ بچے کے جنم سے پریشان نہ ہو۔ قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا ۝ یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام۔ السری مردوں میں سے اسے کہتے ہیں جو عظیم خصال کا حامل ہو اور سردار ہو۔ حسن نے فرمایا: اللہ کی قسم! مردوں میں سے السری تھا یعنی سردار تھا۔ کہا جاتا ہے: سَرِيَ فلان علی فلان۔

جمہور علماء نے کہا: یہ اس نالی کی طرف اشارہ ہے جو کھجور کے تنا کے قریب تھی (2)۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: السری سے مراد نہر ہے جس کا پانی ختم ہو چکا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم کے لیے اسے جاری فرما دیا۔ النہر کو سریا کہتے ہیں گویا اس کا پانی اس میں چلتا ہے جیسا شاعر نے کہا:

سَلْمٌ تَرَى الدَّالِيَّ منه أَزْوَرَا   إذا يَعُبُّ فی السَّرِيِّ هَرْهَرَا

لبید نے کہا:

فتوسطا عُرْضَ السَّرِيِّ وصَدَّعا   مَسْجُورَةً مُتَجَاوِرًا قُلَّامُهَا

بعض علماء نے فرمایا: حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے حضرت مریم کو ندا دی حضرت مریم کے دل کی تسکین کے لیے یہ معجزہ اور نشانی تھی۔ پہلا قول اظہر ہے۔ حضرت ابن عباس نے اسے فناداھا ملك من تحتها، پڑھا ہے۔ علماء نے فرمایا: حضرت جبرئیل علیہ السلام اس جگہ سے پست جگہ پر تھے جس پر حضرت مریم موجود تھیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَهُزِّيْٓ اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا ۝ فَكُلِيْ وَاشْرَبِيْ وَقَرِّيْ عَيْنًا اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ وَهُزِّيْٓ اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم کو خشک کھجور کے تنا کو حرکت دینے کا حکم دیا تا کہ مردہ تنا کے احیا میں دوسری نشانی دیکھ لیں۔ بِجِذْعِ میں باء زائدہ موکدہ ہے جیسے کہا جاتا ہے: خذ بالزمام و أعط بیدك۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ اِلَى السَّمَآءِ (الحج: 15) یعنی فلیمدد سببا۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے کھجور کے تنا پر جو تر کھجوریں ہیں انہیں اپنی طرف جھکاؤ۔ تُسٰقِطْ اصل میں تتساقط ہے تاء کو سین میں ادغام کیا گیا ہے۔ حمزہ نے تساقط پڑھا

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 11

2۔ تفسیر ثعلبی، جلد 2، صفحہ 324

ہے یعنی تخفیف کے ساتھ انہوں نے تا کو حذف کر دیا ہے جس کو دوسروں نے ادغام کیا ہے۔ عاصم نے حفص کی روایت میں تساقط تاء کے ضمہ کے ساتھ تخفیف اور قاف کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ دونوں تا کے اظہار کے ساتھ تتساقط بھی پڑھا گیا ہے۔ یساقط یا اور تا کے ادغام کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔ تسقط اور یسقط، تَسْقُطُ و یَسْقط تا کے ساتھ نخلة کی وجہ سے اور یا کے ساتھ جذع کی وجہ سے تو قرائتیں ہیں ان کو زمخشری نے ذکر کیا ہے۔ رُطَبًا، اس کو نصب هُزِّيْ کی وجہ سے ہے یعنی جب تو تنے کو حرکت دے گی تو اس کی حرکت سے تر کھجوروں کو حرکت دے گی۔ بہر حال رُطَبًا کی نصب میں قرأت کے معانی کے اعتبار سے اختلاف ہے کبھی فعل کو الجذع کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اور کبھی الهزء کی طرف، کبھی النخلة کی طرف اور جَنِيًّا اس کا معنی ہے جو پک چکی ہیں اور چننے کے قابل ہو چکی ہیں یہ جنيت الثمرة سے مشتق ہے۔ حضرت ابن مسعود سے مروی ہے کہ انہوں نے تساقط عليك رطباً جنيا برنيا پڑھا ہے مگر یہ صحیح نہیں۔ مجاہد نے کہا: رُطَبًا جَنِيًّا وہ عجوہ کھجور تھی۔ حضرت عباس بن فضل نے کہا: میں نے ابو عمرو بن العلاء سے رطبا جنيا، کے بارے پوچھا تو انہوں نے کہا: وہ ابھی خشک نہیں ہوئی تھی اور چننے والوں کے ہاتھوں سے دور نہیں ہوئی تھی یہ صحیح قول ہے۔ فراء نے کہا: الجنی والمجنی کا معنی ایک ہے؛ اس کا نظریہ یہ ہے کہ قتیل اور مقتول، جریح اور مجروح کی طرح ہے۔ فراء کے علاوہ علماء نے کہا: الجنی وہ کھجوریں جو ایک درخت سے کاٹی گئی ہوں اور اس مکان سے لی گئی ہو جہاں وہ پیدا ہوئیں بطور دلیل یہ شعر پڑھا:

وطيب ثمارٍ فی رياضٍ اَرِيضةٍ   واغصان اشجارٍ جَناها على قُرُبٍ

الجنی سے مراد وہ ہے جو چنی جاتی ہیں یعنی جو کاٹی جاتی ہیں۔ حضرت ابن عباس نے کہا: وہ تنا بالکل خشک تھا جب حضرت مریم نے اسے حرکت دی تو آپ نے تنے کے اوپر دیکھا وہاں سبز پتے ظاہر ہو چکے تھے پھر اس کے گابھے کو دیکھا جو ان ٹہنیوں اور پتوں سے نکل چکا تھا پھر سبز کھجوریں بنیں پھر آدھی پکی کچی کھجوریں بنیں پھر سرخ ہوئیں پھر پک گئیں پھر چھوارے کی شکل میں بن گئیں، اور یہ سب کچھ آنکھ جھپکنے کی دیر میں ہوا کھجوریں آپ کے سامنے گرتیں اور اس میں کوئی پھٹنی نہیں تھی۔

مسئلہ نمبر 2۔ بعض علماء نے اس آیت سے یہ استدلال کیا ہے کہ رزق اگرچہ حتمی ہے مگر اللہ تعالیٰ نے ابن آدم کے لیے کوشش کو مقرر فرمایا ہے کیونکہ اس نے حضرت مریم علیہا السلام کو تنے کو حرکت دینے کا حکم دیا تاکہ وہ نشانی دیکھ لے اور نشانی تب ہوتی جبکہ وہ اس کے حرکت دینے کے بغیر ہوتا۔

مسئلہ نمبر 3۔ رزق میں محنت کی تکلیف دینا، اللہ تعالیٰ کی اپنے بندوں میں سنت ہے یہ توکل کے منافی نہیں بخلاف جاہل صوفیاء کے جو کہتے ہیں کہ محنت کرنا توکل کے خلاف ہے۔ یہ مفہوم پہلے گزر چکا ہے۔ اس سے پہلے حضرت مریم کے پاس رزق بغیر تکسب و محنت کے آتا تھا جیسا کہ ارشاد فرمایا: كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا جب حضرت مریم نے بچہ جنم دیا تو انہیں تنے کو حرکت دینے کا حکم دیا گیا۔ ہمارے علماء نے فرمایا: جب حضرت مریم کا دل فارغ تھا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں تکسب سے فارغ کر دیا تھا جب انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جنم دیا اور ان کا دل اس کی محبت سے معلق ہوا اور اس کی بات اور اس کے امر کے ساتھ ان کا باطن مشغول ہوا تو اللہ تعالیٰ نے مریم کو کسب کی طرف متوجہ کر دیا اور اسے

عادت کی طرف لوٹا دیا کہ وہ اسباب کے ذریعے رزق دیتا ہے۔ طبری نے ابن زید سے حکایت کیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے حضرت مریم سے کہا: لَا تَحْزَنِيْ تو پریشان نہ ہو۔ حضرت مریم نے کہا: میں کیسے فکرمند نہ ہوں جبکہ تو میرے ساتھ ہے؟ نہ میں خاوند والی ہوں نہ مملوکہ ہوں لوگوں کے سامنے میرا عذر کیا ہوگا؟ يٰلَيْتَنِيْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَ كُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا ۝ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے حضرت مریم سے کہا: میں کلام کر کے تمہاری طرف سے جواب دوں گا۔

مسئلہ نمبر 4۔ ربیع بن خثیم نے کہا: اس آیت کی وجہ سے میرے نزدیک بچہ جنم دینے والی عورتوں کے لیے کھجوروں سے بہتر کوئی چیز نہیں ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کے نزدیک بچہ جنم دینے والی عورتوں کے لیے کوئی اور چیز افضل ہوتی تو اللہ تعالیٰ حضرت مریم کو وہی کھلاتا۔ اسی وجہ سے علماء نے فرمایا: اس وقت سے نفاس والی عورتوں کے لیے چھواروں کی عادت ہے اسی طرح گھٹی بھی کھجور سے دی جاتی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: جب بچہ جنم دینا مشکل ہو تو کھجور سے زیادہ بہتر کوئی چیز نہیں اور مریض کے لیے شہد سے زیادہ بہتر کوئی چیز نہیں؛ یہ زمخشری نے ذکر کیا ہے۔ ابن وہب نے کہا: امام مالک نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے فرمایا: رُطَبًا جَنِيًّا، الجنی اس کھجور کو کہتے ہیں جو بغیر نقش اور فساد کے پکی ہوئی ہو۔ النقش یہ ہے کہ آدھی پکی آدھی کچی کھجور کو نیچے سے کانٹے مارنا تا کہ جلدی پک جائے۔ ایسا کرنا مکروہ ہے۔ امام مالک کے نزدیک یہ وقت سے پہلے کسی چیز کو جلدی تیار کرنا ہے ایسا کرنا کسی کے لیے مناسب نہیں اگر کوئی ایسا کرے گا تو بیع کے لیے ایسا کرنا جائز نہ ہوگا نہ اس کو پکانے کے لیے یہ جائز ہوگا۔ اس پر گفتگو سورۂ انعام میں گزر چکی ہے۔ طلحہ بن سلیمان سے جنیا اتباع کے طور پر جیم کے کسرہ کے ساتھ مروی ہے یعنی ہم نے نہر اور کھجور میں دو فائدے رکھے ہیں، ایک کھانا، پینا اور دوسرا دل کی تسلی کیونکہ یہ دونوں معجزے ہیں۔ فَكُلِيْ وَ اشْرَبِيْ وَ قَرِّيْ عَيْنًا، کا یہی مفہوم ہے یعنی کھجوروں سے کھاؤ، نہر سے پانی پیو اور اپنے بیٹے کو دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی کرو۔ قَرِّيْ قاف کے فتحہ کے ساتھ پڑھا گیا ہے اور یہ جمہور کی قرات ہے۔ طبری نے قری کو قاف کے کسرہ کے ساتھ حکایت کیا ہے۔ یہ مجد کی لغت ہے کہا جاتا ہے کہ قرّ عینا یقِرّ ویقَرّ قاف کے ضمہ اور کسرہ کے ساتھ۔ أقر اللہ عینہ فقرت، اللہ نے اس کی آنکھوں کو ٹھنڈا کیا تو وہ ٹھنڈی ہو گئیں۔ یہ القر اور القرۃ سے ماخوذ ہے۔ دونوں کا معنی ٹھنڈا ہونا ہے۔ خوشی کے آنسو ٹھنڈے ہوتے ہیں اور غم کے آنسو گرم ہوتے ہیں۔ ایک جماعت نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے، انہوں نے کہا: ہر آنسو گرم ہوتا ہے۔ أقر اللہ عینہ کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ محبوب کے دیدار کے ساتھ تیری آنکھوں کو ٹھنڈا کرے تا کہ وہ ٹھنڈی ہو اور سکون پائے۔ فلان قرۃ عینی یعنی فلان کے قرب سے میرے نفس کو سکون ملتا ہے۔ شیبانی نے کہا: قَرِّيْ عَيْنًا اس کا معنی ہے تو سو جا، اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم کو کھانے، پینے اور سونے پر ابھارا۔ ابو عمرو نے کہ: أقر اللہ عینہ کا مطلب ہے اللہ نے اسے سُلا یا اور اس کے جاگنے کو ختم کر دیا۔ عَيْنًا پر نصب تمیز کے اعتبار سے ہے جیسے تیرا قول ہے: طب نفسا، حقیقت میں فعل آنکھ کے لیے تھا پھر اسے آنکھ والے کی طرف نقل کر دیا اور جو حقیقت میں فاعل تھا اسے تفسیر کی بنا پر نصب دی گئی مثلاً طب نفساً۔ تفقأت شحماً و تصببت عرقاً۔ اس کی اور بھی بہت سی مثالیں ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ الْبَشَرِ اَحَدًا ۙ فَقُوْلِيْۤ اِنِّيْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِمَّا تَرَیِنَّ اصل میں ترأیین تھا ہمزہ کو حذف کیا گیا جس طرح تری سے ہمزہ حذف کیا گیا ہے۔ پھر اس کا فتحہ راء کی طرف نقل کیا گیا ہے تو یہ تریین بن گیا پھر پہلی یاء کو الف سے بدلا کیونکہ وہ متحرک ہے اور اس کا ماقبل مفتوح ہے۔ پھر دو ساکن الف اور یاء تانیث جمع ہوئے تو التقاء ساکنین کی وجہ سے الف کو حذف کر دیا گیا تو ترین ہوا پھر جزم کی علامت کے طور پر نون کو حذف کیا گیا کیونکہ اِن حرف شرط اور ماصلۃ ہے۔ پس تری رہ گیا۔ پھر نون ثقیلہ داخل ہوا تو التقاء ساکنین کی وجہ سے یاء تانیث کو کسرہ دیا کیونکہ نون ثقیلہ دو نونوں کے قائم مقام ہوتا ہے اور پہلا نون ساکن ہے پس یہ ترین بن گیا۔ اس طریقہ پر ابن درید کا قول ہے:

أماترى رأسي حاكى لونهٗ

اور الافوہ کا قول ہے:

إما تَرَیْ رأسي أزْرَی بِهٖ

اور یہاں ما کے توطئہ کے لیے نون داخل ہوا ہے جس طرح اس کے دخول کے لیے لام قسم بطور توطئہ داخل کیا جاتا ہے۔

طلحہ، ابوجعفر اور شیبہ نے ترین یاء کے سکون اور نون کے فتحہ کے ساتھ تخفیف سے پڑھا ہے۔ ابوالفتح نے کہا: یہ شاذ ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَقُوْلِیْٓ اِنِّیْ نَذَرْتُ یہ جواب شرط ہے اور اس میں اضمار ہے یعنی تیرے بچے کے متعلق کوئی سوال کرے تو تو یہ کہہ کہ میں نے خاموشی کے روزے کی نذر مانی ہے؛ یہ حضرت ابن عباس اور حضرت انس بن مالک کا قول ہے (1)۔ حضرت ابی بن کعب کی قرأت میں انی نذرتُ للرحمن صوماً صمتاً ہے۔ حضرت انس سے یہ بھی مروی ہے اور حضرت انس سے وصمتا واؤ کے ساتھ بھی مروی ہے۔ لفظوں کا اختلاف دلالت کرتا ہے کہ ایک تفسیر کے لیے ذکر کیا گیا ہے نہ کہ قرأت کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ جب اس کے ساتھ واؤ ہو تو ممکن ہے کہ یہ روزے کے علاوہ ہو۔ محدثین اور لغات کے رواۃ سے جو روایات مروی ہیں وہ متفق ہیں کہ روزے سے مراد خاموشی ہے کیونکہ الصوم کا مطلب بھی امساک (رکنا) ہے اور الصمت کا معنی کلام سے رکنا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: الصوم سے مراد روزہ ہی ہے اور ان لوگوں پر روزے کے دن خاموشی بھی لازم ہوتی تھی مگر اشارہ کے ساتھ کلام جائز تھا اس بنا پر حضرت انس کی قرأت وصمتاً واؤ کے ساتھ ہوگی۔ الصمت (خاموشی) ان کے نزدیک روزے میں نذر کے ساتھ لازم تھی جیسا کہ کسی نے ہم میں سے بیت اللہ کی طرف چلنے کی نذر مانی تو یہ حج یا عمرہ کے ساتھ احرام کا بھی مقتضی ہے۔ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیل کی زبان پر حضرت مریم کو حکم دیا یا ان کے بیٹے کی زبان پر انہیں حکم دیا جیسا کہ اختلاف گزر چکا ہے کہ انسان سے مخاطب ہونے سے رک جانا اور اپنے بیٹے کی طرف سوال کرنے والے کو پھیر دینا تا کہ وہ اس کی خجالت کو دور کرے۔ معجزہ ظاہر ہو اور حضرت مریم کا عذر قبول ہو۔

آیت کا ظاہر یہ ہے کہ حضرت مریم کے لیے یہ الفاظ کہنا مباح کیا گیا تھا جو آیت کے اندر موجود ہیں؛ یہ جمہور کا قول ہے۔ ایک جماعت نے کہا: اس کا مطلب ہے تو اشارہ سے یہ کہہ نہ کہ کلام سے۔ زمخشری نے کہا: اس سے ثابت ہوتا ہے کہ (سفیہ)

1۔ تفسیر طبری، جز 16-15، صفحہ 88

بیوقوف پر خاموش ہونا واجب ہے اور لوگوں میں سے ذلیل ترین وہ بیوقوف ہے جو بیوقوف کو نہ سمجھے۔

مسئلہ نمبر 3۔ جس نے نذر کے ساتھ یہ التزام کیا کہ وہ آدمیوں میں سے کسی سے بات نہیں کرے گا تو یہ احتمال رکھتا ہے کہ یہ قربت ہو اور نذر کے ساتھ لازم ہوئی ہو اور یہ بھی احتمال رکھتا ہے کہ یہ ہماری شرع میں جائز نہیں کیونکہ اس میں نفس کی تعذیب اور تنگی ہے جیسے کوئی نذر مانے کہ وہ دھوپ میں کھڑا ہوگا۔ اس بنا پر خاموشی کی نذر اس شریعت میں تھی ہماری شریعت میں نہیں۔ یہ مسئلہ پہلے گزر چکا ہے جس نے خاموشی کی نذر مانی تھی؛ حضرت ابن مسعود نے اسے کلام کرنے کا حکم دیا تھا اور ابواسرائیل کی حدیث کی وجہ سے یہی صحیح ہے۔ اس حدیث کو امام بخاری نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا۔ ابن زید اور سدی نے کہا: پہلے لوگوں کے نزدیک صیام (روزہ) رکھنے اور کلام کرنے سے رکنا تھا۔

میں کہتا ہوں: ہماری سنت سے ہے کہ ہم بھی روزے کی حالت میں قبیح کلام سے رک جائیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی روزہ دار ہو تو وہ نہ بری بات کرے اور نہ جہالت کا کام کرے، اگر کوئی شخص اس سے لڑے یا اسے گالی دے تو اسے اتنا کہنا چاہیے میں روزہ رکھے ہوئے ہوں" (1)۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "جو جھوٹی بات اور جھوٹ پر عمل کو نہ چھوڑے تو اللہ تعالیٰ کو اس کے کھانا، پینا چھوڑنے کی حاجت نہیں" (2)۔

فَاَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُهٗ ۭ قَالُوْا يٰمَرْيَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَيْـــًٔـا فَرِيًّا ۝ يٰٓاُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِيًّا ۝

"اس کے بعد وہ لے آئیں بچہ کو اپنی قوم کے پاس (گود میں) اٹھائے ہوئے انہوں نے کہا: اے مریم! تو نے بہت برا کام کیا ہے۔ اے ہارون کی بہن! نہ تیرا باپ برا آدمی تھا اور نہ ہی تیری ماں بدچلن تھی"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُهٗ روایت کیا گیا ہے کہ حضرت مریم معجزات دیکھ کر مطمئن ہو گئیں اور انہیں یقین کامل ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ ان کا معذور ہونا ظاہر فرمائے گا تو اس مکان سے بچے کو اٹھا کر لے آئیں جس میں پہلے چلی گئی تھیں۔ حضرت ابن عباس نے کہا: جب سورج نکلا تھا تو آپ ان کے پاس سے چلی گئی تھیں اور ظہر کے وقت ان کے پاس واپس آئیں اور ساتھ بچہ بھی اٹھائے ہوئے تھیں۔ یہ حمل اور اس کی ولادت دن کی تین ساعتوں میں ہوئی تھی۔ کلبی نے کہا: آپ نے بچے کو وہاں جنم دیا جہاں کی قوم کو خبر نہ تھی، آپ نفاس کے چالیس دن ٹھہری رہیں پھر بچے کو اٹھا کر قوم کے پاس لے آئیں جب لوگوں نے آپ کو دیکھا اور آپ کے ساتھ بچے کو دیکھا تو وہ پریشان ہوئے اور ان کے گھر والے نیک لوگ تھے تو انہوں نے انکار کرتے ہوئے کہا: لَقَدْ جِئْتِ شَيْـــًٔـا فَرِيًّا ۝ تو نے بہت برا کام کیا ہے۔ برا کام جیسے کوئی ایسی چیز لانے والا جو اس نے خود گھڑی ہوتی ہے۔ مجاہد نے کہا: فَرِيًّا کا معنی عظیم ہے (3)۔ سعید بن سعدۃ نے کہا: ایسا کام جو گھڑا ہوا اور بناوٹی ہو، کہا جاتا ہے: فریت و افریت، دونوں کا معنی ایک ہے۔ زنا کا بچہ گھڑی ہوئی اور بناوٹی چیز کی طرح ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصیام، حفظ اللسان، جلد 1، صفحہ 363

2۔ صحیح بخاری، کتاب الصوم، من لم یدع قول الزور والعمل بہ، جلد 1، صفحہ 255

3۔ تفسیر طبری، جز 16، صفحہ 91

نے فرمایا: وَلَا یَاْتِیْنَ بِبُهْتَانٍ یَّفْتَرِیْنَهٗ بَیْنَ اَیْدِیْهِنَّ وَ اَرْجُلِهِنَّ (الممتحنہ:12)

یعنی بچے کو خاوند سے لاحق کرنے کا قصد کرنا جو اس خاوند سے نہ ہو۔ کہا جاتا ہے: فلان یفری الفری، یعنی وہ ایسا کام کرتا ہے جو انتہا کو پہنچا ہوا ہو۔ ابوعبیدہ نے کہا: الفری، عجیب اور نادر چیز کو کہتے ہیں؛ یہ اخفش کا قول ہے۔ فرمایا: فریا کا معنی ہے عجیب، الفری کا معنی کاٹنا بھی ہے گویا جو کام عادت کو ختم کرتا ہے یا عجیب اور نادر ہونے کی وجہ سے قول کو کاٹتا ہے۔ قطرب نے کہا: الفری نئے کام کو کہتے ہیں یعنی تو نے ایک نیا کام کیا ہے پہلے تو تو نے کبھی ایسا نہیں کیا۔ ابوحیوہ نے شیئا فریا، پڑھا ہے (یعنی راء کے سکون کے ساتھ) سدی اور وہب بن منبہ نے کہا: جب حضرت مریم بچہ اٹھائے ہوئے اپنی قوم کے پاس آئیں تو بنو اسرائیل میں یہ بات مشہور ہوگئی ان کے مرد اور عورتیں جمع ہوئے ایک عورت نے آپ کو مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا تو اللہ تعالیٰ نے اس کی اس طرف کو خشک کر دیا پس وہ اسے اسی طرح اٹھائے رہی۔ ایک اور شخص نے کہا: یہ تو زنا کارہ ہے، تو اللہ تعالیٰ نے اسے گونگا کر دیا تو لوگ آپ کو مارنے سے رک گئے اور کوئی اذیت ناک کلمہ کہنے سے باز آگئے اور وہ بڑے نرم انداز میں آہستہ سے یہ کہنے لگے: یٰمَرْیَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَیْـًٔا فَرِیًّا۔ الراجز نے کہا:

قد أطعمتِي دقلا حوليا مسوسا مدودا حجريا

وكنتِ تفرين به الفريا(1)

یعنی تو اس کو بڑا سمجھتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یٰۤاُخْتَ هٰرُوْنَ اس اخوت کے معنی میں اختلاف ہے اور یہ ہارون کون ہے؟ بعض علماء نے فرمایا: یہ حضرت ہارون حضرت موسیٰ علیہ السلام کا بھائی ہے، مراد یہ ہے کہ جس کو ہم عبادت میں ہارون کی مثل گمان کرتے تھے وہ ایسا فعل کرتی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس بنا پر حضرت مریم حضرت موسیٰ کے بھائی حضرت ہارون کی اولاد سے تھی۔ پس اخوت کے ذریعے ان کی طرف منسوب کی گئی کیونکہ ان کی اولاد سے تھی جیسے تیمی کو کہا جاتا ہے: یا اخا تیم اور عربی کو کہا جاتا ہے: یا اخا العرب۔ بعض علماء نے فرمایا: حضرت مریم کا ایک باپ کی طرف سے بھائی تھا جس کا نام ہارون تھا کیونکہ یہ نام بنی اسرائیل میں کثرت سے تھا لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بھائی ہارون کے نام کے ساتھ برکت حاصل کرنے کے لیے ہارون نام رکھتے تھے اور بنی اسرائیل میں وہ ایک مثالی شخص تھا۔ بعض علماء نے کہا: ہارون یہ ایک اس زمانہ کا نیک صالح شخص تھا جس دن ان کا وصال ہوا اس کے جنازہ میں چالیس ہزار افراد آئے۔ تمام کا نام ہارون تھا۔ قتادہ نے کہا: اس زمانہ میں بنی اسرائیل میں ایک عابد شخص تھا جو صرف اللہ تعالیٰ سے لو لگائے ہوئے تھا اسے ہارون کہا جاتا تھا(2)۔ پس لوگوں نے حضرت مریم کو اس اخوت کی طرف منسوب کیا کیونکہ اس سے پہلے وہ ہارون کے طریقہ پر تھی کیونکہ وہ عبادت گاہ کی خدمت پر وقف تھی یعنی اے نیک صالحہ عورت! تیری شان کے لائق یہ عمل نہیں تھا۔ کعب احبار نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی موجودگی میں کہا: حضرت مریم، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بھائی ہارون کی بہن نہیں تھی۔ حضرت عائشہ نے اسے کہا: تو نے غلط کہا ہے۔ کعب نے کہا: اے ام المومنین اگر نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہا ہے تو آپ سب سے سچی خبر دینے والے ہیں ورنہ میں ان کے

1۔ تفسیر طبری، جز 16، صفحہ 91

2۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 14

درمیان چھ سو سال کی مدت پاتا ہوں۔ فرمایا: یہ سن کر حضرت عائشہ خاموش ہو گئیں۔ صحیح مسلم میں حضرت مغیرہ بن شعبہ سے مروی ہے (1) فرمایا: جب میں نجران آیا تو لوگوں نے مجھ سے پوچھا انہوں نے کہا: تم پڑھتے ہو یٰٓاُخْتَ ھٰرُوْنَ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے اتنی مدت پہلے تھے۔ جب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا تو میں نے اس کے متعلق پوچھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "لوگ اپنے انبیاء اور گزرے ہوئے صالحین کے ناموں کے ساتھ نام رکھتے تھے"۔ غیر صحیح میں بعض طرق میں آیا ہے کہ نصاریٰ نے حضرت مغیرہ سے کہا: تمہارا ساتھی گمان کرتا ہے کہ مریم، ہارون کی بہن ہے حالانکہ ان کے درمیان چھ سو سال کی مدت ہے۔ مغیرہ نے کہا: میں نہیں جانتا جو میں کہوں۔ آگے حدیث ذکر کی۔ مطلب یہ ہے کہ ایک اسم، دوسرے اسم کے موافق ہوتا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انبیاء کے اسماء کے ساتھ نام رکھنا جائز ہے۔ واللہ اعلم۔

میں کہتا ہوں: حدیث صحیح دلالت کرتی ہے کہ موسیٰ اور عیسیٰ اور ہارون کے درمیان لمبا زمانہ تھا۔ زمخشری نے کہا: حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کے درمیان ہزار سال یا اس سے زائد سالوں کا زمانہ تھا۔ پس یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ حضرت مریم، حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون کی بہن تھی۔ اگر یہ صحیح ہو تو اس طرح ہوگا جیسا کہ سدی نے کہا ہے کہ وہ حضرت ہارون علیہ السلام کی نسل سے تھی یہ ایسے ہے جیسے تو کہتا ہے قبیلہ کے شخص کو: یا اخا فلان، اسی سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے: إن أخا صُداء قد أذّن فمن أذّن فهو يقيم (2)، صدائی نے آذان دی ہے۔ پس جو آذان دے وہی تکبیر کہے اور یہ پہلا قول ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: ایک جماعت نے کہا: اس زمانہ میں ایک فاجر شخص تھا اس کا نام ہارون تھا (3) پس انہوں نے عار دلانے اور زجر و توبیخ کرنے کی جہت سے اس کی طرف نسب کی ہے؛ طبری نے اس کا ذکر کیا ہے اور قائل کا نام ذکر نہیں کیا۔

میں کہتا ہوں: غزنوی نے یہ سعید بن جبیر سے روایت کیا ہے کہ وہ فاسق شخص تھا اور فجور میں مثال تھا۔ پس اس کی طرف نسبت کی گئی۔ مطلب یہ ہے کہ تیرا باپ اور تیری والدہ اس فعل کے اہل نہ تھے تو نے یہ کیسے کیا؟ یہ تعریض ہے جو تصریح کے قائم مقام ہے۔ یہ ہمارے نزدیک حد کو ثابت کرتی ہے۔ مزید بیان سورۃ النور میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ آخری قول کو حدیث صحیح رد کرتی ہے وہ نص صریح ہے پس کسی کے لیے کلام کی گنجائش نہیں اور اس پر کوئی غبار نہیں ہے۔ والحمد للہ۔ عمر بن لجا التیمی نے مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ پڑھا ہے۔

فَاَشَارَتْ اِلَيْهِ ۖ قَالُوْا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا ﴿۲۹﴾ قَالَ اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ ۟ؕ اٰتٰىنِيَ الْكِتٰبَ وَ جَعَلَنِيْ نَبِيًّا ﴿۳۰﴾ وَّ جَعَلَنِيْ مُبٰرَكًا اَيْنَ مَا كُنْتُ ۪ وَ اَوْصٰنِيْ بِالصَّلٰوةِ وَ الزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَيًّا ﴿۳۱﴾ وَّ بَرًّۢا بِوَالِدَتِيْ ۫ وَ لَمْ يَجْعَلْنِيْ جَبَّارًا شَقِيًّا ﴿۳۲﴾ وَ السَّلٰمُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُّ وَ يَوْمَ اَمُوْتُ وَ يَوْمَ اُبْعَثُ حَيًّا ﴿۳۳﴾

"اس پر مریم نے بچہ کی طرف اشارہ کیا لوگ کہنے لگے: ہم کیسے بات کریں اس سے جو گہوارہ میں (کمسن) بچہ

1۔ صحیح مسلم، کتاب الادب، جلد 2، صفحہ 207
2۔ سنن ابی داود، کتاب الصلوٰۃ، فی الرجل یؤذن ویقیم، جلد 1، صفحہ 76
3۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 14

ہے (اچانک) بچہ بول پڑا کہ میں اللہ کا بندہ ہوں اس نے مجھے کتاب عطا کی ہے اور اس نے مجھے نبی بنایا مجھے حکم دیا ہے نماز ادا کرنے کا اور زکوٰۃ دینے کا جب تک میں زندہ رہوں۔ اور مجھے خدمت گزار بنایا ہے اپنی والدہ کا اور اس نے نہیں بنایا مجھے جابر (اور) بدبخت۔ اور سلامتی ہو مجھ پر جس روز میں پیدا ہوا اور جس دن میں مروں گا اور جس دن مجھے اُٹھایا جائے گا زندہ کرکے"۔

اس میں پانچ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاَشَارَتْ اِلَيْهِ ۭ قَالُوْا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا۝ حضرت مریم کو ترک کلام کا جو حکم دیا گیا تھا۔ آپ نے اسے لازم پکڑا۔ اس آیت میں وارد نہیں ہے کہ آپ نے اِنِّيْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا بول کر کہا تھا بلکہ یہ وارد ہے کہ آپ نے اشارہ فرمایا۔ پس یہ ان علماء کے قول کو تقویت دیتا ہے کہ (قول) کا جو امر آپ کو دیا گیا تھا اس سے مراد اشارہ ہے۔ روایت ہے کہ جب آپ نے بچے کی طرف اشارہ کیا تو لوگوں نے کہا: اس کا ہمارے ساتھ استخفاف اس کے زنا سے بھی ہم پر زیادہ سخت ہے۔ پھر انہوں نے تقریر و ثبوت کی جہت سے کہا: كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا۝، (1) اس آیت میں كَانَ سے مراد ماضی نہیں کیونکہ جو بھی مہد میں ہوتا ہے وہ بچہ ہی ہوتا ہے بلکہ یہ الآن (اب) کے معنی میں ہے۔ ابوعبیدہ نے کہا: کان یہاں لغو ہے؛ جیسے شاعر نے کہا:

و جِيرانٍ لنا كانوا كرامِ

بعض علماء نے فرمایا: کان یہاں وجود اور حدوث کے معنی میں ہے جیسے ارشاد ہے: وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ (البقرہ: 280) یہ پہلے گزر چکا ہے۔ ابن انباری نے کہا: اسے زائدہ کہنا جائز نہیں کیونکہ صبیًا کو اس نے نصب دی ہے اور کان بمعنی حدث ہونا تو کہتا ہے: وکان الحر، یعنی اس صورت میں صرف اسم ذکر ہوتا ہے۔ صحیح یہ ہے کہ مَنْ جزا کے معنی میں ہے یعنی شرطیہ ہے اور کان بمعنی یکن ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے: من یکن فی المهد صبیا فکیف نکلمه (جو پنگھوڑے میں کمسن بچہ ہے ہم اس سے کیسے بات کریں) جیسے تو کہتا ہے: کیف أعطی من کان لا یقبل عطیة۔ میں اسے کیسے عطا کروں جو عطیہ قبول ہی نہیں کرتا یعنی: من یکن لا یقبل کبھی ماضی، جزا میں مستقبل کے معنی میں ہوتی ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تَبٰرَكَ الَّذِيْٓ اِنْ شَاۗءَ جَعَلَ لَكَ خَيْرًا مِّنْ ذٰلِكَ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ (الفرقان: 10) اس آیت میں اِنْ شَاۗءَ جَعَلَ کا معنی ان یشا یجعل ہے اور تو کہتا ہے: من کان إلی منه إحسان کان إلیه منی مثله، یعنی من یکن منه إلی احسان یکن إلیه منی مثله۔ جس کا مجھ پر احسان ہوگا اس پر میری طرف سے اس کی مثل احسان ہوگا۔ المهد بعض علماء نے فرمایا: وہ چارپائی پنگھوڑے کی طرح تھی۔ بعض نے فرمایا: یہاں المهد سے مراد ماں کی گود ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: مطلب یہ ہے کہ ہم اس سے کیسے بات کریں کمسنی کی وجہ سے پنگھوڑے میں سونا جس کا معمول ہے۔ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان کی باتیں سنیں تو آپ نے اپنی آرام گاہ میں لیٹے ہوئے کہا: اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ الخ۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 14

مسئلہ نمبر 2۔ بعض علماء نے فرمایا: حضرت عیسیٰ علیہ السلام دودھ پی رہے تھے جب انہوں نے لوگوں کی باتیں سنیں تو دودھ پینا چھوڑ دیا اور ان کی طرف متوجہ ہوئے اور بائیں طرف پر سہارا لیا اور ان کی طرف اپنی دائیں سبابہ انگلی سے اشارہ کیا اور فرمایا: اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ سب سے پہلے آپ نے اللہ تعالیٰ کے عبد ہونے کا اعتراف کیا اور اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا اقرار کیا تا کہ ان لوگوں کا رد ہو جائے جو آپ کے بعد آپ کی شان میں غلو کرنے والے تھے۔ الکتاب سے مراد انجیل ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: بچپن کی حالت میں آپ کو کتاب عطا فرمائی تھی اور اس کا فہم اور علم بھی بخشا تھا اور اس وقت انہیں نبوت عطا فرمائی تھی جیسا کہ حضرت آدم علیہ السلام کو اسماء سکھائے تھے۔ وہ اس وقت روزہ بھی رکھتے تھے اور نماز بھی پڑھتے تھے۔ یہ انتہائی ضعیف قول ہے جیسا کہ ہم اس کے بعد مسئلہ میں بیان کریں گے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ نے ازل میں مجھے کتاب اور نبوت دینے کا حکم دیا تھا اگرچہ کتاب فی الحال نازل نہیں ہوئی تھی؛ یہ اصح قول ہے۔

وَّ جَعَلَنِیْ مُبٰرَكًا، برکت والا بنایا۔ دین میں نفع دینے والا، اس کی طرف بلانے والا، اور اس کی معرفت کی تعلیم دینے والا بنایا۔ تستری نے کہا: اس کا معنی ہے وہ مجھے نیکی کا حکم دینے والا اور برائی سے منع کرنے والا اور گمراہوں کو راہ ہدایت دینے والا، مظلوم کی مدد کرنے والا اور مجبور کی معاونت کرنے والا بنایا۔ **وَ اَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوةِ وَ الزَّكٰوةِ** یعنی جب میں مکلف ہوں تو نماز اور زکوٰۃ ادا کروں جب میرے لیے ان کی ادائیگی ممکن ہو۔ یہ آخری صحیح قول کے مطابق ہے۔ **مَا دُمْتُ حَیًّا،** ماظرف کی بناء پر محل نصب میں ہے یعنی دوام حیاتی (جب تک میری زندگی ہے) **وَّ بَرًّۢا بِوَالِدَتِیْ،** فرمایا اور ہوالدی نہیں فرمایا۔ تو معلوم ہوا کہ یہ چیز اللہ کی طرف سے تھی۔

وَ لَمْ یَجْعَلْنِیْ جَبَّارًا اور اس نے مجھے جابر و متکبر نہیں بنایا جو غصہ میں آ کر قتل کرتا ہے اور مارتا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: جبار وہ ہوتا ہے جو اپنے اوپر کسی کا حق نہیں دیکھتا۔ **شَقِیًّا** خیر سے محروم، اس نے اس کا معنی نافرمان کیا ہے، بعض نے رب کا نافرمان معنی کیا ہے۔ بعض نے فرمایا: اس نے مجھے اپنے حکم کا تارک نہیں بنایا کہ میں بدبخت ہوں جس طرح ابلیس اللہ کے حکم کو ترک کر کے بدبخت ہوا۔

مسئلہ نمبر 3۔ حضرت مالک بن انس رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کے تحت فرمایا: یہ اہل القدر پر کتنی سخت ہے (1)۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس بات کی خبر دی جو فیصلہ ہو چکا ہے اور جو ان کی وصال تک ہونے والا ہے۔ اس آیت کے قصص میں ابن زید سے روایت ہے کہ انہوں نے جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا کلام سنا تو انہیں یقین ہو گیا۔ اور انہوں نے کہا: یہ کسی امر عظیم کی وجہ سے ہے۔ روایت ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے طفولیت میں کلام کی تھی۔ یہ اس آیت سے ثابت ہے لیکن پھر بچوں کی حالت پر لوٹ گئے تھے حتی کہ انسانی عادت کے مطابق بچوں کی طرح بڑھے۔ آپ کا بولنا اپنی والدہ کی برأت کے لیے تھا نہ کہ وہ اس حالت میں یہ شعور رکھتے تھے وہ اس طرح بولے تھے جس طرح اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اعضاء انسانی کو قوت گویائی بخشے گا۔ یہ منقول نہیں ہے کہ وہ ہمیشہ بولتے رہے۔ اور نہ وہ نماز پڑھتے تھے جب وہ ایک دن یا ایک مہینہ کے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 15

تھے۔ اگر وہ اس بچپن میں متواتر بولتے رہتے اور تسبیح ونصیحت اور نماز پڑھتے رہتے تو یہ چیز پوشیدہ نہ ہوتی۔ یہ تمام چیزیں پہلے قول کے فساد پر دلیل ہیں اور قائل کی جہالت پر صریح ہیں اور یہ بھی دلیل ہے کہ آپ پنگھوڑے میں بولے تھے، جبکہ یہود ونصاریٰ کا قول اس کے مخالف ہے۔ یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ نماز، روزہ، والدین کی خدمت گزاری پہلی امتوں پر بھی واجب تھیں یہ وہ چیزیں ہیں جن کا حکم ثابت رہا اور آپ کی شریعت میں یہ حکم منسوخ نہ ہوا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام انتہائی متواضع تھے درختوں کے پتے کھاتے تھے اور بالوں سے بنا ہوا لباس پہنتے تھے اور مٹی پر بیٹھتے تھے اور جہاں رات ہو جاتی وہی رہ جاتے تھے۔ آپ کا کوئی خاص مسکن نہ تھا۔ صلی اللہ علی نبینا وعلیہ وسلم۔

مسئلہ نمبر 4۔ کوفیوں نے کہا: گونگے کا قذف اور لعان صحیح نہیں ہے اس کی مثل شعبی سے بھی مروی ہے۔ امام اوزاعی، امام احمد اور اسحاق نے بھی یہی کہا ہے۔ ان علماء کے نزدیک قذف صریح زنا کے لفظ سے صحیح ہے اور اس کے معنی سے۔ اور گونگے سے ضرورۃً قذف صحیح نہیں ہے، پس وہ قاذف نہ ہوگا۔ اشارہ کے ساتھ زنا، حلال اور شبہ وطی سے ممتاز نہیں ہوتا۔ نیز یہ علماء کہتے ہیں: لعان ہمارے نزدیک شہادت ہیں اور گونگے کی شہادت بالاجماع مقبول نہیں ہے۔ ابن القصار نے کہا: ان کا یہ قول ہے کہ قذف صرف صریح زنا سے ثابت ہوتا ہے۔ یہ تمام زبانوں کے اعتبار سے باطل ہے سوائے عربی زبان کے۔ اسی طرح گونگے کا اشارہ ہے اور انہوں نے جو اجماع ذکر کیا ہے کہ گونگے کی شہادت کے عدم قبولیت پر اجماع ہے یہ بھی غلط ہے۔ امام مالک کی نص موجود ہے کہ ان کے اشارہ کو سمجھا جاتا ہو تو اس کی شہادت مقبول ہے اس کا اشارہ لفظ کے ساتھ شہادت دینے کے قائم مقام ہوگا۔ رہا یہ کہ لفظ پر قدرت ہو تو پھر لفظ کے ساتھ ہی شہادت واقع ہوگی۔ ابن المنذر نے کہا: مخالفین گونگے کی طلاق، بیع اور باقی تمام احکام لازم کرتے ہیں، پس قذف بھی اس کی مثل ہونا چاہیے۔ مہلب نے کہا: بہت سے فقہی ابواب میں اشارہ کلام سے قوی ہوتا ہے مثلاً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بعثت أنا والساعة كهاتين، میں اور قیامت ان دو انگلوں کی طرح قریب قریب مبعوث کیے گئے ہیں۔ ہم ان دو انگلیوں کے درمیان جو قرب ہے اسے وسطی انگلی کی سبابہ پر زیادتی کی مقدار سے جانتے ہیں۔ دانشوروں کا اجماع ہے کہ عیان (مشاہدہ) خبر سے اقویٰ ہوتا ہے۔ اس میں دلیل ہے کہ اشارہ بعض مواقع پر کلام سے قوی ہوتا ہے۔

وَالسَّلٰمُ عَلَيَّ، اللہ کی طرف سے مجھ پر سلام ہو۔ زجاج نے کہا: اس سے پہلے سلام کا لفظ الف، لام کے بغیر ذکر کیا گیا تھا پس دوبارہ الف، لام کے ساتھ ذکر کرنا بہتر تھا۔ يَوْمَ وُلِدْتُّ یعنی دنیا میں۔ بعض نے فرمایا: شیطان کے وسوسہ سے۔ یہ سورۂ آل عمران میں گزر چکا ہے۔ وَيَوْمَ اَمُوْتُ یعنی قبر میں۔ وَيَوْمَ اُبْعَثُ حَيًّا ۝ یعنی آخرت میں، کیونکہ آپ کے تین احوال تھے: دنیا میں زندہ رہنا، قبر میں مردہ ہونا، آخرت میں اٹھنا۔ تو آپ نے تمام حالات میں سلامتی بھیجی؛ یہ کلبی کے قول کا معنی ہے پھر آپ کا کلام پنگھوڑے میں ختم ہو گیا حتی کہ اس عمر کو پہنچے جس میں عام بچے بولتے ہیں۔ قتادہ نے کہا: ہمارے لیے ذکر کیا گیا ہے کہ ایک عورت نے دیکھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہر زمانہ میں مُردوں کو زندہ کرتے ہیں (1)، اندھوں اور برص کے

1۔ تفسیر طبری، جز 15، صفحہ 97

مریضوں کو درست کرتے ہیں تو اس نے کہا: مبارک ہو اس بطن کو جس نے تجھے اٹھائے رکھا اور مبارک ہو اس سینے کو جس نے تجھے دودھ پلایا تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اسے کہا: مبارک ہو اسے جس نے کتاب اللہ کی تلاوت کی اور اس کی پیروی کی جو کتاب اللہ میں تھا اور کتاب اللہ پر عمل کیا۔

ذٰلِكَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ ۚ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِيْ فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ ۝ مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ ۙ سُبْحٰنَهٗ ۭ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝ وَاِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ۭ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ۝ فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ مِنْۢ بَيْنِهِمْ ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ مَّشْهَدِ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝ اَسْمِعْ بِهِمْ وَاَبْصِرْ ۙ يَوْمَ يَاْتُوْنَنَا لٰكِنِ الظّٰلِمُوْنَ الْيَوْمَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ وَاَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ اِذْ قُضِيَ الْاَمْرُ ۘ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ وَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ اِنَّا نَحْنُ نَرِثُ الْاَرْضَ وَمَنْ عَلَيْهَا وَاِلَيْنَا يُرْجَعُوْنَ ۝

"یہ عیسیٰ بن مریم ہیں۔ یہ زیبا ہی نہیں اللہ تعالیٰ کو کہ وہ کسی کو اپنا بیٹا بنائے وہ پاک ہے جب وہ فیصلہ فرما دیتا ہے کسی کام کا تو بس صرف اتنا حکم دیتا ہے اس کے لیے کہ ہو جا تو وہ کام ہو جاتا ہے۔ اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ میرا بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی سو اسی کی عبادت کیا کرو یہی سیدھا راستہ ہے۔ پھر کئی گروہ آپس میں اختلاف کرنے لگے پس ہلاکت ہے کفار کے لیے اس دن کی حاضری سے جس دن آئیں گے ہمارے پاس لیکن یہ ظالم آج کھلی گمراہی میں ہیں۔ اور اے نبی کریم! آپ ڈرایئے انہیں حسرت وندامت کے دن سے جب ہر بات کا فیصلہ کر دیا جائے گا اور آج یہ لوگ غفلت میں ہیں اور یہ ایمان نہیں لاتے۔ یقیناً ہم ہی وارث ہوں گے زمین کے اور جو کچھ اس کے اوپر ہے اور ہماری طرف ہی سب لوٹائے جائیں گے"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ذٰلِكَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ یعنی یہ جس کا ہم نے ذکر کیا ہے وہ عیسیٰ ابن مریم ہے پس اسی طرح تم اس پر اعتقاد رکھو نہ اس طرح کہو جس طرح یہود کہتے ہیں کیونکہ وہ درست نہیں ہے وہ کہتے ہیں: یہ یوسف نجار کا بیٹا ہے اور اس طرح بھی تم نہ کہو جس طرح نصاریٰ نے کہا: وہ اللہ ہے اور الہ کا بیٹا ہے۔ قَوْلَ الْحَقِّ کسائی نے کہا: یہ عیسیٰ کی لغت ہے یعنی ذٰلِكَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ ۚ قَوْلَ الْحَقِّ حضرت عیسیٰ کو قول الحق کہا گیا جس طرح انہیں کلمۃ اللہ کہا گیا(1)۔ الحق سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ ابو حاتم نے کہا: اس کا معنی ہے ھو قول الحق۔ تقدیر کلام اس طرح ہے ھذا الکلام قول الحق، حضرت ابن عباس نے فرمایا: اس سے مراد یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یہ کلام قول حق ہے، باطل نہیں ہے، قول کو الحق کی طرف اس طرح مضاف کیا گیا ہے جس طرح اس آیت میں ہے: وَعْدَ الصِّدْقِ الَّذِيْ كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ ۝ (الاحقاف) یعنی الوعد الصدق، اور فرمایا: وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ (یوسف: 109) یعنی الدار الآخرۃ، یعنی موصوف کو صفت کی طرف مضاف کیا گیا

1۔ الکشاف، جلد 2، صفحہ 509

ہے۔ عاصم اور عبداللہ بن عامر نے قول الحق حال کی بنا پر منصوب پڑھا ہے، یعنی أقول قولاً حقا، ذالك میں اشارہ کا معنی اس میں عامل ہے۔ زجاج نے کہا: یہ مصدر ہے یعنی أقول قول الحق، کیونکہ اس کا ماقبل اس پر دلالت کرتا ہے۔ بعض نے فرمایا: مدح کی بنا پر منصوب ہے۔ بعض نے فرمایا: اغراء کی بنا پر منصوب ہے۔ عبداللہ نے قالُ الحق پڑھا ہے۔ حسن نے قُولُ الحقِ، ق وف کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے، اسی طرح سورۂ انعام میں قوله الحق کو پڑھا ہے۔ القَول، القَالُ، القُولُ تمام کا ایک معنی ہے جیسے الرَّهَبُ الرُّهبُ کا معنی ایک ہے۔ الذی، عیسیٰ کی صفت ہے۔ فِیۡهِ یَمۡتَرُوۡنَ، شک کرتے ہیں یعنی عیسیٰ بن مریم جس میں یہ شک کرتے ہیں۔ سچا قول ہے۔ بعض نے فرمایا: یَمۡتَرُوۡنَ کا معنی اختلاف کرتے ہیں۔ عبدالرزاق نے ذکر کیا ہے فرمایا: ہمیں معمر نے قتادہ سے روایت کر کے ذٰلِكَ عِیۡسَی ابۡنُ مَرۡیَمَ ۚ قَوۡلَ الۡحَقِّ الَّذِیۡ فِیۡهِ یَمۡتَرُوۡنَ ۝ کے متعلق بتایا کہ بنو اسرائیل جمع ہوئے اور پھر انہوں نے اپنے میں سے چار افراد نکالے ہر قوم نے اپنا عالم نکالا پس وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے اختلاف کرنے لگے جب وہ اٹھائے گئے۔ ایک نے کہا: وہ اللہ تھا وہ زمین پر اُترا، اسے زندہ کیا جسے زندہ کیا اور اسے موت دی جسے موت دی پھر وہ آسمان کی طرف چڑھ گیا۔ یہ گروہ یعقوبیہ تھا۔ دوسرے تینوں نے کہا: تم نے جھوٹ کہا ہے پھر ان میں سے دو نے تیسرے شخص سے کہا: تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے بات کر، اس نے کہا: وہ اللہ کا بیٹا ہے؛ یہ گروہ نسطوریہ ہے۔ پھر دوسروں نے کہا: تو نے غلط کہا ہے، پھر دو میں سے ایک نے دوسرے سے کہا: تو بات کر، اس نے کہا: تین میں سے تیسرا تھا، اللہ الٰہ ہے، عیسیٰ بھی الٰہ ہے اور اس کی والدہ بھی الٰہ ہے؛ یہ گروہ اسرائیلیہ ہے جو نصاریٰ کے ملوک ہیں۔ چوتھے نے کہا: تو نے غلط کہا ہے بلکہ وہ اللہ کا بندہ اور اس کا رسول، اس کی روح، اس کا کلمہ ہے؛ یہ مسلمان ہیں۔ پس ان میں سے ہر ایک کے متبعین ہیں جیسا کہ انہوں نے فرمایا: وہ آپس میں لڑے تو مسلمانوں پر غلبہ دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَ یَقۡتُلُوۡنَ الَّذِیۡنَ یَاۡمُرُوۡنَ بِالۡقِسۡطِ مِنَ النَّاسِ (آل عمران: 21) سے یہی مراد ہے۔ قتادہ نے کہا: یہ وہ لوگ ہیں (1) جن کے بارے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَاخۡتَلَفَ الۡاَحۡزَابُ مِنۡۢ بَیۡنِهِمۡ، انہوں نے اس میں اختلاف کیا اور وہ کئی گروہ بن گئے۔ الَّذِیۡ فِیۡهِ یَمۡتَرُوۡنَ کا یہی معنی ہے۔ ابو عبدالرحمن سلمی کی قرات تمتون (تاء کے ساتھ ہے) حضرت ابن عباس نے فرمایا: حضرت مریم کے چچا کا بیٹا حضرت مریم اور ان کے بیٹے کو لیکر مصر کی طرف چلا گیا اور وہ اس میں بارہ سال رہے حتیٰ کہ وہ بادشاہ مر گیا جس سے وہ خوف کرتے تھے؛ یہ ماوردی نے ذکر کیا ہے۔

میں کہتا ہوں: مصر کی تاریخ میں واقع ہے جو میں نے دیکھی ہے اور انجیل میں بھی آیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت بیت لحم میں ہوئی تھی اور اس وقت هیرودس بادشاہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے یوسف نجار کو خواب میں وحی فرمائی اور اسے فرمایا: اُٹھ اور اس بچے اور اس کی والدہ کو لیکر مصر کی طرف چلا جا اور وہاں رہے حتیٰ کہ میں تجھے کہوں کیونکہ هیرودس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو تلاش کرنے کا پختہ ارادہ کیا ہوا تھا تاکہ اسے ہلاک کر دے پس یوسف خواب سے بیدار ہوا اور اپنے رب کے حکم کی پیروی کی انہوں نے حضرت مسیح علیہ السلام اور مریم ان کی والدہ کو ساتھ لیا اور مصر میں آ گیا مصر آتے وقت وہ بلسان کے کنویں پر اترا جو قاہرہ کی زمین میں تھا۔

1۔ تفسیر طبری، جز 15، صفحہ 100

حضرت مریم نے اس کنویں پر کپڑے دھوئے بلسان ایسی جگہ ہے جہاں کوئی چیز نہیں اگتی سوائے اس جگہ کے (جہاں حضرت مریم نے کپڑے دھوئے تھے) اسی جگہ سے وہ تیل نکلتا ہے جو اس زیتون سے ملایا جاتا ہے جس کا نصاریٰ قصد کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے مصریوں میں اس تیل کی ایک بوتل کی بہت بڑی قیمت ہے۔ یہ تیل نصاریٰ کے بادشاہوں ملک قسطنطنیہ، ملک صقلیہ، ملک حبشہ، ملک النوبہ، ملک الفرنجہ اور دوسرے بادشاہوں کو جب مصر کے بادشاہ ہدیہ بھیجتے ہیں تو ان کے ہاں اس کی بڑی قدر و منزلت ہوتی ہے۔ ہر تحفہ سے زیادہ یہ تحفہ محبوب ہوتا ہے۔ اس سفر میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اشمونین اور فسقام (جواب المحرقۃ کے نام سے معروف ہے) کے شہروں میں گئے۔ اسی وجہ سے اب بھی نصاریٰ ان شہروں کی تعظیم کرتے ہیں اور عید الفصح میں ہر جگہ سے ان شہروں کی طرف آتے ہیں کیونکہ یہ انتہا ہے مصر کی زمین کی جہاں مسیح علیہ السلام پہنچے تھے اور یہاں سے شام کی طرف لوٹے تھے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَا كَانَ لِلّٰهِ یعنی اللہ کے لیے زیبا نہیں۔ اَنْ یَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ کہ وہ کسی کو اپنا بیٹا بنائے۔ مِنْ کلام کے لیے صلہ ہے یعنی ان یتخذ ولدا۔ اَنْ، کَانَ کا اسم ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے یعنی کسی کو بیٹا بنانا اسکی صفت سے نہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی بات سے اپنی ذات کو منزہ و مبرا فرمایا (سبحانہٗ) وہ کسی کو بیٹا بنانے سے پاک ہے۔ اِذَا قَضٰۤى اَمْرًا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ ﴿۳۵﴾ اس پر تفصیلی گفتگو سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے۔ وَ اِنَّ اللّٰهَ رَبِّیْ وَ رَبُّكُمْ، اہل مدینہ، ابن کثیر اور ابو عمرو نے اَنَّ کو ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور اہل کوفہ نے ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے کہ یہ نئی کلام ہے۔ اس پر دلیل ابی کی قرأت ہے كُنْ فَیَكُوْنُ ﴿۳۵﴾ اِنَّ اللّٰهَ یعنی بغیر واو کے اور انہوں نے قَالَ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ پر عطف کیا ہے۔ اور ہمزہ کے فتحہ کی صورت میں کئی اقوال ہیں۔ خلیل اور سیبویہ کا مذہب یہ ہے کہ اس کا معنی ہے ولان اللہ ربی و ربکم اور اسی طرح وَّ اَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ (الجن: 18) ان دونوں نحویوں کے نزدیک اَنْ محل نصب میں ہے۔ اور فراء نے لام کے حذف کی بنا پر محل جر میں ہونا بھی جائز قرار دیا ہے۔ اور اس اعتبار سے بھی محل جر میں ہونا جائز قرار دیا ہے کہ یہ اس مفہوم میں ہو وَ اَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوةِ وَ الزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَیًّا و بان اللہ ربی و ربکم، اور کسائی نے محل رفع میں ہونا بھی جائز قرار دیا ہے کہ یہ اس معنی میں ہوگا والأمر ان اللہ ربی و ربکم، اس میں پانچواں قول بھی ہے۔ ابو عبیدہ نے حکایت کیا ہے کہ ابو عمرو بن العلاء نے یہ کہا ہے کہ یہ اس معنی میں ہوگا وقضیٰ ان اللہ ربی و ربکم اور یہ امراً پر عطف ہے جو اِذَا قَضٰۤى اَمْرًا کے قول سے ہے۔ معنی یہ ہوگا اذا قضیٰ امراً و قضیٰ أن اللہ۔ اس تقدیر پر اور تیسری تقدیر پر ان کے ساتھ ابتدا جائز نہ ہوگی اور باقی وجوہ پر ان کے ساتھ ابتدا جائز ہوگا۔

فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ ﴿۳۶﴾ یعنی دین مستقیم جس میں کوئی کجی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ مِنْۢ بَیْنِهِمْ، مِنْ زائدہ ہے یعنی اختلف الأحزاب بینھم، قتادہ نے کہا: یعنی جو ان کے درمیان اختلاف تھا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے اہل کتاب کے فرقوں میں اختلاف تھا۔ یہود قدح کرتے اور جادو کا الزام لگاتے۔ نصاریٰ میں سے نسطوریہ کہتے: وہ اللہ کا بیٹا ہے۔ ملکانیہ نے کہا: تین میں سے تیسرا ہے۔ یعقوبیہ نے کہا: وہ اللہ ہے۔ نصاریٰ نے افراط اور غلو کیا اور یہود نے تفریط اور کوتاہی کی۔ یہ بحث سورۃ النساء میں گزر چکی ہے۔ حضرت ابن عباس نے کہا: اَلْاَحْزَابُ سے مراد وہ لوگ ہیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف گروہ در گروہ آئے تھے اور مشرکین میں سے جنہوں نے آپ کو جھٹلایا تھا۔

فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ مَّشْهَدِ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۔ مَشْهَدِ سے مراد قیامت کے دن کی حاضری ہے۔ مشہد بمعنی مصدر ہے۔ الشہود کا معنی الحضور ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ الحضور لھم کے معنی میں ہو اور ظرف کی طرف مضاف کیا گیا ہے کیونکہ اس دن میں حاضری کا وقوع ہے جیسے کہا جاتا ہے: ویل لفلان من قتال یوم کذا، یعنی من حضورہ ذالك الیوم۔ بعض علماء نے فرمایا: المشھد سے مراد وہ جگہ ہے جہاں لوگ حاضر ہوں گے جیسے محشر وہ جگہ جہاں لوگ جمع ہوں گے۔ بعض نے فرمایا: اس کا مطلب ہے ہلاکت ہے کافروں کے لیے اس مشہد میں حاضر ہونے کی وجہ سے جس میں وہ مشورہ کے لیے جمع ہوئے پھر اللہ تعالیٰ کا انکار کرنے پر اتفاق کیا اور اس قول پر اجماع کیا کہ اللہ تین میں سے تیسرا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَسْمِعْ بِهِمْ وَ اَبْصِرْ ۙ يَوْمَ يَاْتُوْنَنَا، ابوالعباس نے کہا: عرب یہ صیغے تعجب کی جگہ استعمال کرتے ہیں تو کہتا ہے: أسمع بزید و أبصر بزید زید کتنا سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔ فرمایا: اس کا معنی ہے اس نے اپنے نبی کو ان پر متعجب کیا۔ کلبی نے کہا: کوئی ان سے زیادہ قیامت کے دن سننے اور دیکھنے والا نہ ہوگا جب اللہ تعالیٰ عیسیٰ علیہ السلام سے فرمائے گا: ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَ اُمِّیَ اِلٰهَیْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (المائدہ: 16) بعض علماء نے فرمایا: اَسْمِعْ کا معنی ہے اس دن وہ اللہ تعالیٰ کی کتنی زیادہ اطاعت کرنے والے ہوں گے۔ لٰكِنِ الظّٰلِمُوْنَ الْيَوْمَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ یعنی دنیا میں ظالم کھلی گمراہی میں ہیں۔ اس سے زیادہ کھلی گمراہی کیا ہو سکتی ہے کہ ایک آدمی اپنے جیسے شخص کے بارے میں یہ عقیدہ رکھے وہ خدا ہے جبکہ اسے رحم نے اٹھایا، اس نے کھایا، پیا، حدث کیا اور محتاج ہوا۔ اسی گمراہی کی بنا پر فرمایا: وہ بہرہ اور اندھا ہے لیکن آخرت میں دیکھے گا اور سنے گا جب عذاب کو دیکھے گا لیکن اس وقت کا سننا اور دیکھنا مفید نہ ہوگا۔ یہ مفہوم قتادہ وغیرہ نے بیان کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ اِذْ قُضِيَ الْاَمْرُ، حضرت عبداللہ بن مسعود سے مروی ہے فرمایا: جو بھی دوزخ میں داخل ہوگا اس کے لیے جنت میں بھی گھر ہوگا پس وہ اس پر حسرت و افسوس کرے گا۔ بعض علماء نے فرمایا: وہ اس وقت حسرت کرے گا جب نامہ اعمال اسے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا۔ اِذْ قُضِيَ الْاَمْرُ، یعنی حساب مکمل ہو جائے گا۔ اہل جنت، جنت میں اور اہل نار آگ میں داخل کر دیئے جائیں گے۔ صحیح مسلم میں حضرت ابوسعید خدری سے مروی ہے (1) فرمایا: نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جب جنتی جنت میں داخل ہوں گے اور دوزخی دوزخ میں داخل ہوں گے تو قیامت کے روز موت کو لایا جائے گا گویا وہ چتکبرا مینڈھا ہے، پس اسے جنت اور دوزخ کے درمیان کھڑا کیا جائے گا۔ کہا جائے گا: اے اہل جنت! کیا تم اسے جانتے ہو؟ پس وہ اپنی گردنیں لمبی کر کے دیکھیں گے اور وہ کہیں گے: ہاں یہ موت ہے''۔ فرمایا: ''پھر کہا جائے گا: اے دوزخیو! کیا تم اسے جانتے ہو وہ گردنیں لمبی کر کے دیکھیں گے اور کہیں گے: ہاں یہ موت ہے''۔ فرمایا: ''پھر اسے ذبح کرنے کا حکم دیا جائے گا تو وہ ذبح کر دی جائے گی پھر کہا جائے گا: اے جنتیو! تمہیں ہمیشہ یہاں رہنا ہے اب موت نہیں ہے اور (کہا جائے گا) اے دوزخیو! تمہیں یہاں ہمیشہ رہنا ہے اب موت نہیں ہے''۔ پھر نبی کریم ﷺ نے یہ آیت تلاوت کی: وَ اَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ اِذْ قُضِيَ الْاَمْرُ ۘ وَ هُمْ فِیْ غَفْلَةٍ وَّ هُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ اس حدیث کو امام بخاری نے حضرت ابن عمر

1۔ جامع ترمذی، کتاب صفة الجنة، ماجاء فی خلود اھل الجنة واھل النار، جلد 2، صفحہ 99

سے، ابن ماجہ نے حضرت ابو ہریرہ کی حدیث سے ترمذی نے حضرت ابو سعید سے مرفوع روایت کی ہے (1) اور فرمایا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ ہم نے یہ اپنی کتاب "التذکرہ" میں ذکر کی ہے اور وہاں ہم نے یہ بیان کیا ہے کہ ان احادیث اور آیات کی وجہ سے کافر ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے اور ہم نے ان کے قول کا رد کیا ہے جو کہتے ہیں کہ غضب کی صفت ختم ہو جائے گی۔ ابلیس اور پیروکار کفار جیسے فرعون، ہامان، قارون اور ان کے مشابہ لوگ بھی جنت میں داخل ہو جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّا نَحْنُ نَرِثُ الْاَرْضَ وَ مَنْ عَلَیْهَا یعنی ہم زمین کے رہنے والوں کو موت دیں گے اور ہم اس کے وارث ہوں گے۔ وَ اِلَیْنَا یُرْجَعُوْنَ۝ قیامت کے روز ہم ہر ایک کو اس کے عمل کی جزا دیں گے۔ یہ مفہوم سورۃ الحجر وغیرہا میں گزر چکا ہے۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ ؕ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ۝ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ يٰۤاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَ لَا يُبْصِرُ وَ لَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْـًٔا ۝ يٰۤاَبَتِ اِنِّيْ قَدْ جَآءَنِيْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِيْۤ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا ۝ يٰۤاَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ ؕ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِيًّا ۝ يٰۤاَبَتِ اِنِّيْۤ اَخَافُ اَنْ يَّمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ فَتَكُوْنَ لِلشَّيْطٰنِ وَلِيًّا ۝ قَالَ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِيْ يٰۤاِبْرٰهِيْمُ ۚ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِيْ مَلِيًّا ۝ قَالَ سَلٰمٌ عَلَيْكَ ۚ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا ۝ وَ اَعْتَزِلُكُمْ وَ مَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ اَدْعُوْا رَبِّيْ ۖ عَسٰۤى اَلَّاۤ اَكُوْنَ بِدُعَآءِ رَبِّيْ شَقِيًّا ۝ فَلَمَّا اعْتَزَلَهُمْ وَ مَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۙ وَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ ؕ وَ كُلًّا جَعَلْنَا نَبِيًّا ۝ وَ وَهَبْنَا لَهُمْ مِّنْ رَّحْمَتِنَا وَ جَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا ۝

"اور ذکر کیجئے آپ کتاب میں ابراہیم علیہ السلام کا وہ بڑا راست باز نبی تھا۔ جب انہوں نے کہا: اپنے باپ سے کہ اے میرے باپ! تو کیوں عبادت کرتا ہے اس کی جو نہ کچھ سنتا ہے اور نہ کچھ دیکھتا ہے اور نہ تجھے فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ اے میرے باپ! بیشک آیا ہے میرے پاس وہ علم جو تیرے پاس نہیں آیا اس لیے تو میری پیروی کر میں دکھاؤں گا تجھے سیدھا راستہ۔ اے باپ! شیطان کی پوجا نہ کیا کر بیشک شیطان تو رحمٰن کا نافرمان ہے۔ اے باپ! میں ڈرتا ہوں کہ کہیں تجھے پہنچے عذاب (خدائے) رحمٰن کی طرف سے تو تو بن جائے شیطان کا ساتھی۔ باپ نے کہا: کیا روگردانی کرنے والا ہے تو میرے خداؤں سے اے ابراہیم؟ اگر تم باز نہ آئے تو میں تمہیں سنگسار کر دوں گا اور دور ہو جاؤ میرے سامنے سے کچھ عرصہ۔ ابراہیم نے (جواب میں) کہا: سلام ہو تم پر میں مغفرت طلب کروں گا تیرے لیے اپنے رب سے، بیشک وہ مجھ پر بے حد مہربان ہے۔ اور میں الگ ہو جاؤں گا تم سے اور (ان سے بھی) جن کی تم عبادت کرتے ہو اللہ کو چھوڑ کر اور میں اپنے رب کی عبادت کروں گا مجھے امید ہے کہ میں اپنے رب کی

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الزہد باب صفۃ النار، حدیث نمبر 4317، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

عبادت کی برکت سے نامراد نہیں رہوں گا۔ پس جب وہ جدا ہو گیا ان سے اور جن کی وہ عبادت کیا کرتے تھے اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر تو عطا فرمایا ہم نے ابراہیم کو اسحق اور یعقوب اور سب کو ہم نے نبی بنایا۔ اور ہم نے عطا فرمائیں انہیں اپنی رحمت سے (طرح طرح کی نعمتیں) اور ہم نے ان کے لیے سچی اور دائمی تعریف کی آواز بلند کر دی"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ ۬ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ۝ یعنی وہ کتاب جو آپ پر نازل کی گئی اس میں حضرت ابراہیم کے واقعہ کا ذکر کریں۔ الصدیق کا معنی سورۂ نساء میں گزر چکا ہے اور الصدق کا اشتقاق سورۂ بقرہ میں بیان ہو چکا ہے، اعادہ کی ضرورت نہیں۔ آیت کا معنی ہے کہ اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم قرآن میں حضرت ابراہیم کے مکالمہ کا ذکر ان پر پڑھیے یہ جان چکے ہیں کہ وہ حضرت ابراہیم کی اولاد سے ہیں وہ حنیف مسلم تھے اور اللہ تعالیٰ کے مد مقابل نہیں بناتے تھے یہ کیوں اللہ کے مد مقابل بناتے ہیں جیسا کہ ارشاد ہے: وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ (البقرہ: 130)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ، ابیہ سے مراد آزر ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ يٰۤاَبَتِ، سورۂ یوسف میں اس پر گفتگو ہو چکی ہے۔ لِمَ تَعْبُدُ کس وجہ سے آپ عبادت کرتے ہیں۔ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْـًٔا ۝ جو نہ سنتے ہیں اور نہ دیکھتے ہیں اور نہ تجھے کچھ فائدہ دیتے ہیں۔ اس سے مراد بت ہیں۔ يٰۤاَبَتِ اِنِّيْ قَدْ جَآءَنِيْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَاْتِكَ یعنی اللہ کی معرفت اور یقین اور جو موت کے بعد ہونا ہے اور جس نے غیر اللہ کی عبادت کی اسے عذاب دیا جائے گا۔ فَاتَّبِعْنِيْٓ اس کی اتباع کرو جس کی طرف میں دعوت دیتا ہوں۔ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا ۝ میں تمہاری دین مستقیم کی طرف راہنمائی کروں گا جس میں نجات ہے۔ يٰۤاَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ وہ جو تمہیں کفر کا حکم دیتا ہے اس کی طاعت نہ کرو جس نے کسی معصیت میں شیطان کی اطاعت کی اس نے اس کی عبادت کی۔ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِيًّا ۝ کان صلۃ (زائدہ) ہے۔ اور بعض علماء نے فرمایا: کان بمعنی صار ہے۔ بعض نے فرمایا: حال کے معنی میں ہے یعنی ھو للرحمن، عصیا اور عاص دونوں کا ایک معنی ہے؛ یہ کسائی کا قول ہے۔ يٰۤاَبَتِ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يَّمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ اگر تو اس عقیدہ پر مر گیا جس پر تو اب ہے تو میں جانتا ہوں کہ رحمن کی طرف سے تجھے عذاب ملے گا۔ اور اخاف بمعنی اعلم ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ اپنے معنی میں ہو معنی یہ ہو کہ مجھے ڈر ہے کہ تو کفر پر مرے گا پھر تجھے عذاب ہوگا۔ فَتَكُوْنَ لِلشَّيْطٰنِ وَلِيًّا ۝ آگ میں ساتھی ہوگا۔ قَالَ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِيْ يٰۤاِبْرٰهِيْمُ کیا تو ان بتوں کو چھوڑ کر دوسرے کسی خدا کی طرف رغبت رکھتا ہے۔ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ، حسین نے کہا: اس کا معنی ہے میں تجھے پتھروں سے ماروں گا۔ ضحاک نے کہا: اس سے مراد ہے میں تجھے گالی دوں گا۔ حضرت ابن عباس نے کہا: اس کا مطلب ہے میں تجھے سزا دوں گا۔ بعض نے کہا: اس کا معنی ہے میں تیرا معاملہ ظاہر کر دوں گا۔ وَاهْجُرْنِيْ مَلِيًّا ۝ حضرت ابن عباس نے فرمایا: اس کا مطلب ہے عزت بچا کر مجھ سے الگ ہو جا کہیں ایسا نہ ہو کہ میری طرف سے تجھے کوئی فساد پہنچے، طبری نے اس کو اختیار کیا ہے۔ اس مفہوم پر مَلِيًّا، ابراہیم سے حال ہوگا۔ حسن اور مجاہد نے کہا: مَلِيًّا کا معنی ہے لمبا زمانہ (1)؛ اسی سے المہلہل کا قول ہے:

1۔ تفسیر طبری، ج 16-15، صفحہ 108

فتصدّعت صمُّ الجبال لموته وبكت علیه المرملات ملیًا

اس شعر میں ملیّا سے مراد لمبا زمانہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالَ سَلٰمٌ عَلَيْكَ، حضرت ابراہیم نے جواب تندی اور ترشی میں نہیں دیا کیونکہ انہیں اس کے کفر پر اسے قتل کرنے کا حکم نہیں دیا گیا تھا۔ جمہور علماء نے کہا ہے کہ یہاں سلام سے مراد مسالمہ ہے یعنی متارکہ (چھوڑنا) ہے سلام نہیں ہے۔ طبری نے کہا: اس کا معنی ہے مجھ سے آپ کو امن ہے۔ اس بنا پر کافر کو پہلے سلام نہیں کیا جائے گا۔ نقاش نے کہا: یہ حلیم کا سفیہ سے خطاب ہے جیسے فرمایا: وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا۝ (الفرقان) بعض علماء نے اسے سلام کے معنی میں فرمایا، یہ جدائی کا سلام ہے اور کافر کو سلام کرنے اور اس کو پہلے سلام کرنے کو جائز قرار دیا ہے۔ ابن عیینہ سے پوچھا گیا: کیا کافر کو سلام کرنا جائز ہے؟ انہوں نے کہا: ہاں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ۝ (الممتحنہ) اور فرمایا: قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ (الممتحنہ) اور حضرت ابراہیم نے اپنے باپ سے کہا: سَلٰمٌ عَلَيْكَ۔

میں کہتا ہوں: اس آیت سے وہی ظاہر ہوتا ہے جو سفیان بن عیینہ نے کہا ہے اور اس باب میں دو صحیح احادیث ہیں۔ حضرت ابوہریرہ نے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے فرمایا: ''یہود اور نصاریٰ کو پہلے سلام نہ کرو اور جب تم ان میں سے کسی کو راستہ میں ملو تو اسے تنگی کی طرف مجبور کرو'' (1)۔ اس حدیث کو بخاری اور مسلم نے روایت کیا ہے۔ صحیحین میں حضرت اسامہ بن زید سے مروی ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم گدھے پر سوار ہوئے جس پر پالان تھا جس کے نیچے فدک کا بنا ہوا کپڑا تھا اور آپ نے پیچھے حضرت اسامہ بن زید کو سوار کیا ہوا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت سعد بن عبادہ کی بنی الحرث بن الخزرج میں عیادت کے لیے جا رہے تھے، یہ جنگ بدر سے پہلے کا واقعہ ہے حتیٰ کہ آپ ایک ایسی مجلس سے گزرے جس میں مسلمان، مشرکین، بت پرست اور یہودی بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں (رئیس المنافقین) عبداللہ بن ابی بن سلول بھی تھا اور مجلس میں حضرت عبداللہ بن رواحہ بھی موجود تھے جب مجلس پر گدھے کا غبار پڑا تو عبداللہ بن ابی نے اپنی ناک اپنی چادر سے ڈھانپ لی اور کہا: ہم پر غبار نہ اڑاؤ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر سلام کیا (الحدیث) پہلی حدیث ابتداً غیر مسلموں کو سلام نہ کرنے کو ظاہر کر رہی ہے کیونکہ سلام کرنا عزت دینا ہے اور کافر اس کا اہل نہیں اور دوسری حدیث ابتداءً سلام کرنے کو جائز ظاہر کر رہی ہے۔ طبری نے کہا: حضرت اسامہ کی مروی، حضرت ابوہریرہ کی حدیث کے معارض نہیں ہے کیونکہ ہر ایک دوسری کے خلاف نہیں ہے۔ یہ اس طرح ہے کہ حضرت ابوہریرہ کی حدیث کا مخرج عموم ہے اور حضرت اُسامہ کی حدیث بیان کرتی ہے کہ اس کا معنی خصوص ہے۔ نخعی نے کہا: جب تجھے یہودی یا نصرانی سے حاجت ہو تو اسے پہلے سلام کر، اس سے ظاہر ہوا کہ حضرت ابوہریرہ کی حدیث (کہ انہیں پہلے سلام نہ کرو (2)) اس صورت میں ہے جب کوئی ایسا سبب نہ ہو جو سلام کرنے کا موجب ہو مثلاً کوئی فیصلہ کرانا ہو، کوئی اور حاجت ہو جو تمہیں ان کی طرف سے لاحق ہو یا سنگت کا حق ہو یا پڑوس کا حق ہو یا سفر کا حق ہو۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب السلام، نهی عن ابتداء اهل الکتاب بالسلام، جلد 2، صفحہ 214

2۔ صحیح بخاری، کتاب الاستیذان، التسلیم فی المجلس فیه اخلاط من المسلمین والمشرکین، جلد 2، صفحہ 924

طبری نے کہا: سلف سے مروی ہے کہ وہ اہل کتاب کو سلام کرتے تھے۔ حضرت ابن مسعود نے ایک کسان کو سلام کیا جو راستے میں آپ کے ساتھ تھا۔ حضرت علقمہ نے کہا: میں نے حضرت عبداللہ بن مسعود سے کہا: اے اباعبدالرحمٰن! کیا اہل کتاب کو پہلے سلام کرنا مکروہ نہیں ہے؟ حضرت عبداللہ نے فرمایا: ہاں، لیکن حق صحبت وسنگت کی وجہ سے مکروہ نہیں ہے۔ حضرت ابوامامہ جب اپنے گھر کی طرف لوٹتے تو مسلمان، نصرانی، چھوٹے بڑے جس کے پاس سے گزرتے اسے سلام کرتے۔ اس کی وجہ ان سے پوچھی گئی تو فرمایا: ہمیں سلام افشاء کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ امام اوزاعی سے اس مسلمان کے بارے پوچھا گیا جو کسی کافر کے پاس سے گزرتا ہے اور پھر اسے سلام کرتا ہے تو انہوں نے فرمایا: اگر تو سلام کرے تو تجھ سے پہلے نیک لوگوں نے سلام کیا ہے اگر تو سلام نہ کرے تو تجھ سے پہلے نیک لوگوں نے سلام کو ترک کیا ہے۔ حسن بصری سے مروی ہے انہوں نے فرمایا: جب تو کسی ایسی مجلس سے گزرے جس میں مسلمان اور کفار ہوں تو انہیں سلام کر۔

میں کہتا ہوں: پہلے مقالہ والوں نے اس سے حجت پکڑی ہے کہ سلام جس کا معنی تحیۃ ہے یہ اس امت کے ساتھ خاص ہے کیونکہ حضرت انس بن مالک کی حدیث ہے فرمایا: نبی پاک ﷺ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے میری امت کو ایسی تین چیزیں عطا فرمائی ہیں جو ان سے پہلے کسی کو عطا نہیں کی گئیں۔ (1) السلام یہ اہل جنت کا سلام ہے" الحدیث۔ اس حدیث کو حکیم ترمذی نے ذکر کیا ہے ان کی سند کے ساتھ سورہ فاتحہ میں گزر چکی ہے۔ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ کے معنی پر کلام گزر چکی ہے اور سلام پر رفع ابتدا کی وجہ سے ہے۔ اس کے نکرہ ہونے کے باوجود اسے مبتدا بنانا جائز ہے کیونکہ نکرہ مخصوصہ، حکم میں معرفہ کے ساتھ متصل ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا۝ ، الحفی جو نیکی کرنے اور مہربانی کرنے میں انتہا کو پہنچا ہوا ہو۔ کہا جاتا ہے: حفی به وتحفی، اس کا معنی ہے اس نے اس سے نیکی اور مہربانی کی۔ کسائی نے کہا: کہا جاتا ہے: حفی بی حفاوۃ وحفوۃ، فراء نے کہا: اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا، یعنی وہ عالم اور باریک بین ہے وہ میری دُعا قبول فرماتا ہے جب میں اس سے دعا مانگتا ہوں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اَعْتَزِلُكُمْ، العزلہ کا معنی جدائی ہے، سورۃ الکہف میں اس کا بیان ہو چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: عَسٰۤى اَلَّاۤ اَكُوْنَ بِدُعَآءِ رَبِّيْ شَقِيًّا۝ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے اہل اور اولاد عطا کرے جن سے وہ تقویت حاصل کرے تاکہ وہ اپنی قوم سے جدائی کی وجہ سے وحشت میں مبتلا نہ ہوں اسی وجہ سے فرمایا: فَلَمَّا اعْتَزَلَهُمْ وَ مَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۙ وَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ ہم نے اسے بیٹے کی نعمت بخش کر اس کی وحشت کو دور کیا۔ حضرت ابن عباس وغیرہ سے یہ مروی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: عَسٰۤى، اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ بندہ قطعی طور پر نہیں کہہ سکتا کہ وہ معرفت پر باقی رہے یا مستقبل میں باقی رہے گا۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ باپ کے لیے ہدایت کی دعا ہے اور عسیٰ سے شک کیا ہے کہ وہ نہیں جانتے کہ کیا اس کے حق میں دعا قبول کی جائے گی یا نہیں؟ پہلا قول اظہر ہے اور فرمایا: وَ جَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا۝ یعنی ہم نے ان کی خوب تعریف کی کیونکہ تمام ملتیں ان انبیاء کرام کی تعریف میں رطب اللسان ہوتی ہیں اور لسان، مذکر اور مونث دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔

1۔ نوادر الاصول، جلد 2، صفحہ 185

وَ اذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مُوْسٰۤى ۚ اِنَّهٗ كَانَ مُخْلَصًا وَّ كَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ۝ وَ نَادَيْنٰهُ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَيْمَنِ وَ قَرَّبْنٰهُ نَجِيًّا ۝ وَ وَهَبْنَا لَهٗ مِنْ رَّحْمَتِنَاۤ اَخَاهُ هٰرُوْنَ نَبِيًّا ۝

"اور ذکر فرمایئے کتاب میں موسیٰ کا بیشک وہ (اللہ کے) چنے ہوئے تھے اور رسول و نبی تھے۔ اور ہم نے انہیں پکارا طور کی دائیں جانب سے اور ہم نے انہیں قریب کیا راز کی باتیں کرنے کے لیے۔ اور ہم نے بخشا انہیں اپنی (خاص) رحمت سے ان کا بھائی ہارون جو نبی تھا"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مُوْسٰۤى یعنی قرآن میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ ان پر پڑھو۔ اِنَّهٗ كَانَ مُخْلَصًا اپنی عبادت میں خلوص رکھتا تھا، ریا کار نہ تھا۔ اہل کوفہ نے لام کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی ہم نے اسے چن لیا اور چنا ہوا بنا دیا۔ وَ نَادَيْنٰهُ ہم نے جمعہ کی رات اس سے کلام کی۔ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَيْمَنِ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دائیں جانب، پہاڑ کے پہلو میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دائیں طرف درخت تھا جب حضرت موسیٰ علیہ السلام مدین سے مصر کی طرف آرہے تھے؛ یہ طبری وغیرہ نے کہا ہے۔ کیونکہ پہاڑوں کا دایاں، بایاں نہیں ہوتا(1)۔ وَ قَرَّبْنٰهُ نَجِيًّا ۝ نَجِيًّا پر نصب حال کی بناء پر ہے، یعنی ہم نے بغیر وحی کے اس سے کلام کی۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا مطلب ہے ہم نے اسے قدر و منزلت کے اعتبار سے اتنا قرب بخشا کہ ہم نے اس سے کلام کی۔ وکیع اور قبیصہ نے سفیان سے انہوں نے عطاء بن سائب سے انہوں نے سعید بن جبیر سے انہوں نے حضرت ابن عباس سے وَ قَرَّبْنٰهُ نَجِيًّا ۝ کے تحت روایت کیا ہے کہ انہیں قریب کیا حتیٰ کہ انہوں نے قلموں کے چلنے کی آواز سنی (2)۔ وَ وَهَبْنَا لَهٗ مِنْ رَّحْمَتِنَاۤ اَخَاهُ هٰرُوْنَ نَبِيًّا ۝ یہ اس وقت ہوا جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سوال کیا وَ اجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ ۝ هٰرُوْنَ اَخِي ۝ (طٰہٰ)

وَ اذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ ۚ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَ كَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ۝ وَ كَانَ يَاْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَ الزَّكٰوةِ ۪ وَ كَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا ۝

"اور ذکر کیجئے کتاب میں اسماعیل کو بیشک وہ وعدہ کے سچے تھے اور رسول (اور) نبی تھے۔ اور وہ حکم دیا کرتے تھے اپنے گھر والوں کو نماز پڑھنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کا اور اپنے رب کے نزدیک بڑے پسندیدہ تھے"۔

اس میں چھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ اس میں اختلاف ہے۔ بعض نے فرمایا: اس اسماعیل سے مراد اسماعیل بن حزقیل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی قوم کی طرف مبعوث کیا تھا تو انہوں نے ان کے سر کی جلد اتاری تھی پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی قوم کو عذاب دینے میں اختیار دیا تھا تو انہوں نے عفو طلب کیا اور اللہ تعالیٰ کے ثواب پر راضی ہوئے اور ان کا معاملہ، معاف کرنے یا عذاب دینے میں اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیا۔ جمہور علماء کا نظریہ یہ ہے کہ یہ اسماعیل ذبیح ابو العرب ابن ابراہیم ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: ذبیح حضرت اسحاق تھے۔ پہلا قول اظہر ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا

1۔ تفسیر طبری، جز 15، صفحہ 110 2۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 20

ہے (٭)۔ اور مزید بحث سورۃ الصافات میں آئے گی ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو وعد الصدق کے ساتھ شرف وعزت بخشنے کے لیے خاص کیا ہے اگرچہ یہ صفت دوسرے انبیاء کرام میں بھی موجود تھی جیسے حلیم، اواہ اور الصدیق، لقب کے طور پر دیے گئے ہیں نیز وہ ان خصائل سے مشہور تھے۔

مسئلہ نمبر 2۔ وعدہ کی سچائی محمود صفت ہے اور یہ انبیاء اور مرسلین کے اخلاق سے ہے۔ اس کی ضد وعدہ خلافی ہے اور مذموم ہے یہ فاسقین اور منافقین کے اخلاق سے ہے جیسا کہ سورۂ برأت میں گزر چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی اسماعیل علیہ السلام کی تعریف کی اور وعدہ کی سچائی کی صفت سے موصوف فرمایا۔ اس کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ صفت اس لیے بخشی گئی کہ انہوں نے اپنے نفس پر ذبح کے وقت صبر کا وعدہ کیا تو انہوں نے صبر کیا حتیٰ کہ فدیہ دیا گیا۔ یہ ان کا قول ہے جو کہتے ہیں: ذبیح اسماعیل تھے۔ بعض علماء نے فرمایا: انہوں نے ایک شخص سے کسی جگہ ملاقات کا وعدہ کیا حضرت اسماعیل آئے اور اس جگہ اس شخص کا ایک دن اور ایک رات انتظار کرتے رہے جب دوسرا دن تھا وہ شخص آیا تو آپ نے اسے فرمایا: میں کل سے تیرے انتظار میں یہاں ہوں۔ بعض نے فرمایا: آپ تین دن انتظار میں رہے (1) اس کی مثل ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بعثت سے پہلے واقعہ آیا ہے۔ یہ واقعہ نقاش نے ذکر کیا ہے اور ترمذی وغیرہ (2) نے عبداللہ بن ابی الحمساء سے روایت کیا ہے فرمایا میں نے بعثت سے پہلے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی بیع کی تو آپ کے لیے کچھ باقی رہ گیا میں نے وعدہ کیا کہ میں وہ مال اسی جگہ لے آؤں گا پھر میں بھول گیا پھر مجھے تین دن کے بعد یاد آیا، میں آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی جگہ موجود تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے جوان! تو نے مجھے بہت تکلف دی ہے میں تین دن سے یہاں تیرا انتظار کر رہا ہوں''۔ یہ ابوداؤد کے الفاظ کا ترجمہ ہے۔ یزید رقاشی نے کہا: حضرت اسماعیل نے بائیس دن اس شخص کا انتظار کیا تھا؛ یہ ماوردی نے ذکر کیا ہے۔ ابن السلام کی کتاب میں ہے کہ آپ نے ایک سال انتظار کیا تھا۔ زمخشری نے یہ حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ آپ نے اپنے ساتھی سے وعدہ کیا ''اس جگہ وہ اس کا انتظار کریں گے'' تو آپ نے پورا سال انتظار کیا اور قشیری نے یہ ذکر کیا ہے کہ ایک سال آپ اپنی جگہ پر رہے حتیٰ کہ جبرئیل امین آپ کے پاس آئے اور کہا کہ وہ تاجر جس نے آپ سے بیٹھنے کا سوال کیا تھا حتیٰ کہ واپس آجائے وہ شیطان تھا آپ نہ بیٹھیے اور اس کے لیے کوئی عزت نہیں۔ یہ بعید ہے اور صحیح نہیں ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: حضرت اسماعیل علیہ السلام نے جو بھی وعدہ کیا اسے پورا کیا۔ یہ صحیح قول ہے اور آیت کا ظاہر بھی اسی کا تقاضا کرتا ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ اس باب سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: العدۃ دین (3) (وعدہ کرنا دین ہے) اور اثر میں مومن کا وعدہ واجب ہے یعنی مومنین کے اخلاق میں وعدہ پورا کرنا واجب ہے ہم نے کہا: یہ بطور فرض واجب نہیں کیونکہ علماء کا اس

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 21 2۔ سنن ابی داؤد، باب فی العدۃ، حدیث نمبر 4344، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ صحیح بخاری، کتاب الھبۃ، إذ وھب الھبۃ أو وعدتم، جلد 1، صفحہ 354

٭ حضرت مفسر کے قول میں بظاہر تعارض ہے یہاں اسے ظاہر قرار دے رہے ہیں جب کہ بعد میں دوسرے قول کو راجح قرار دیتے ہیں۔

پر اجماع ہے جو ابو عمر نے حکایت کیا ہے کہ جس نے مال کا وعدہ کیا جو موجود تھا تو وہ دوسرے قرض خواہوں کے ساتھ اس کو حساب سے لے گا اسی وجہ سے ہم نے کہا: وعدہ پورا کرنا مروّت اور اچھی بات ہے اس کا قطعی فیصلہ نہیں کیا جائے گا۔ عرب وعدہ پورا کرنے پر مدح کرتے ہیں اور وعدہ شکنی پر مذمت کرتے ہیں۔ اسی طرح تمام امتوں میں تھا۔ شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

مَتَى ما يقلْ حُرٌّ لصاحبِ حاجةٍ نَعَمْ يقضِها والحرُّ لِلواْيِ ضامن

''آزاد آدمی جب اپنے کسی حاجت مند ساتھی سے ہاں کہتا ہے تو اس کی حاجت پوری کرتا ہے اور آزاد آدمی وعدے کا ضامن ہوتا ہے''۔

اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ وفا کرنے والا شکر اور تعریف کا مستحق ہے جبکہ عہد شکنی کرنے والا مذمت کا مستحق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے وعدہ سچ کرنے والے اور نذر پوری کرنے والے کی تعریف فرمائی تو اس کے لیے یہی مدح وثنا کافی ہے جبکہ اس کے مخالف کے لیے مذمت ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ امام مالک نے فرمایا: جب کوئی شخص کسی کو ہبہ کرنے کا سوال کرے اور وہ اسے ہاں کہے پھر اس کے لیے ایسا نہ کرنا ظاہر ہو تو میرے خیال میں اس پر کچھ لازم نہیں۔ امام مالک نے کہا: اگر یہ صورت اگر قرض کی ادائیگی میں ہو پھر وہ اس سے کہے کہ اس کی طرف سے قرض ادا کردے اس نے کہا: ٹھیک ہے اور وہاں اور بہت سے افراد ہوں جو اس پر گواہی دیں تو اس پر چیز لازم ہوگی جب اس پر دو آدمی گواہی دیں۔ امام ابو حنیفہ اور اس کے اصحاب اور امام اوزاعی، امام شافعی اور تمام فقہاء نے کہا: وعدہ کرنے سے کوئی چیز لازم نہیں کیونکہ یہ منافع ہیں عاریہ چیز میں اس کا قبضہ نہیں ہوا کیونکہ وہ طاری ہے اور غیر عاریہ میں جو اشخاص اور اعیان ہیں جو ہبہ کیے جاتے ہیں ان پر قبضہ نہ ہو تو مالک کو ان میں رجوع کا حق ہوتا ہے۔ امام بخاری میں ہے: اذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ ۫ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ، ابن اشوع نے وعدہ کی وجہ سے فیصلہ کیا یہ انہوں نے حضرت سمرہ بن جندب سے روایت کر کے ذکر کیا ہے۔ امام بخاری نے فرمایا: میں نے اسحاق بن ابراہیم کو دیکھا وہ ابن اشوع کی حدیث سے حجت پکڑتے تھے (1)۔

مسئلہ نمبر 5۔ وَ كَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا۝ بعض علماء نے فرمایا: حضرت اسماعیل علیہ السلام کو جرہم قبیلہ کی طرف مبعوث کیا گیا اور تمام نبی جب وعدہ کرتے تھے تو اسے سچا کر دکھاتے تھے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کا خصوصی اس صفت کے ساتھ ذکر کرنا ان کو شرف بخشنے کے لیے ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ وَ كَانَ يَاْمُرُ اَهْلَهٗ، حسن نے فرمایا: اہل سے مراد ان کی امت ہے اور حضرت ابن مسعود کی قرأت میں اس طرح تھا۔ وکان یامر اھلہ جُرھم وولدہ بالصلوۃ والزکاۃ، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ كَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا یعنی پسندیدہ پاکیزہ اور صالح تھے۔ کسائی اور فراء نے کہا: جنہوں نے مرضی کہا انہوں نے رضیت کی بنا پر کہا۔ کسائی اور فراء نے کہا: اہل حجاز مرضو کہتے ہیں، نیز ان نحویوں نے کہا: عربوں میں سے کچھ لوگ رضوان، رضیان کہتے ہیں۔ پس

1۔ صحیح بخاری کتاب الشہادات، باب من امر انجاز الوعد

رضوان، مرضو کی بنا پر ہے۔ بصری علماء صرف رضوان اور ربوان کہنا جائز قرار دیتے ہیں۔ ابوجعفر نحاس نے کہا میں نے ابواسحاق زجاج کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ وہ لکھنے میں غلطی کرتے ہیں اور ربا کو یاء کے ساتھ لکھتے ہیں، پھر اس سے بڑی شدید غلطی یہ کرتے ہیں کہ ربیان کہتے ہیں اور یہ صرف ربوان اور رضوان جائز ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مَاۤ اٰتَیْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّیَرْبُوَاۡ فِیْۤ اَمْوَالِ النَّاسِ (روم:39)

وَ اذْكُرْ فِی الْكِتٰبِ اِدْرِیْسَ٘ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّیْقًا نَّبِیًّاۙ۝ وَّ رَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِیًّا۝

''اور ذکر فرمایئے کتاب میں ادریس (علیہ السلام) کا بیشک وہ بڑے راستباز تھے (اور) نبی تھے۔ اور ہم نے بلند کیا تھا انہیں بڑے اونچے مقام تک''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اذْكُرْ فِی الْكِتٰبِ اِدْرِیْسَ٘ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّیْقًا نَّبِیًّا۝ حضرت ادریس علیہ السلام پہلے شخص ہیں جنہوں نے قلم کے ساتھ لکھا اور کپڑے سینے اور سلے ہوئے کپڑے پہننے کا آغاز بھی آپ سے ہوا۔ علم نجوم اور حساب اور ستاروں کے چلنے میں غور وفکر بھی آپ سے شروع ہوا۔ اور ادریس کو ادریس اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ کتاب اللہ کا کثرت سے درس دیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ پر تیس صحیفے نازل کیے جیسا کہ حضرت ابوذر کی حدیث میں ہے۔ زمخشری نے کہا: بعض علماء نے کہا: ادریس کو، ادریس کتاب اللہ کا کثرت سے درس دینے کی وجہ سے کہا جاتا ہے۔ آپ کا نام اخنوخ تھا اور یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ اگر یہ درس سے افعیل کے وزن پر ہوتا تو اس میں غیر منصرف ہونے کا صرف ایک سبب ہوتا اور وہ علمیت ہے اور اس کا غیر منصرف ہونا اس کے عجمہ ہونے پر دلیل ہے اسی وجہ سے ابلیس عجمی ہے یہ ابلاس سے مشتق نہیں ہے جیسا کہ بعض لوگوں نے کہا ہے اور اسی طرح یعقوب، العقب سے نہیں ہے اور اسرائیل، اسرال سے نہیں ہے جیسا کہ ابن السکیت نے گمان کیا ہے۔ جو تحقیق نہیں کرتا اور علوم میں مہارت حاصل نہیں کرتا اس سے اس قسم کی اغلاط کثرت سے ہوتی ہیں اور یہ جائز ہے کہ ادریس کا معنی اس لغت میں اس مفہوم کے قریب ہو اور راوی نے الدرس سے مشتق خیال کر لیا ہے۔ ثعلبی اور غزنوی وغیرہما نے کہا: یہ حضرت نوح کے دادا تھے اور یہ خطا ہے۔ سورۂ اعراف میں اس کا بیان گزر چکا ہے اسی طرح سیرت میں واقع ہے حضرت نوح علیہ السلام بن لامک بن متوشلخ بن اخنوخ یہ ادریس نبی علیہ السلام ہیں جیسا کہ گمان کرتے ہیں واللہ اعلم۔ اور یہ پہلے شخص تھے جس کو بنی آدم سے نبوت دی گئی تھی اور قلم کے ساتھ سب سے پہلے انہوں نے لکھا اس کا شجرہ نسب یہ ہے۔

ادریس بن برد بن مہلائیل بن قینان بن یانش بن شیث بن آدم صلی اللہ علیہ وسلم۔ واللہ اعلم۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَّ رَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِیًّا۝ حضرت انس بن مالک اور حضرت ابوسعید وغیرہما نے کہا(1): مَكَانًا عَلِیًّا سے مراد چوتھا آسمان ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی مروی ہے اور کعب احبار نے بھی یہی کہا ہے۔ حضرت ابن عباس اور ضحاک نے کہا: اس سے مراد چھٹا آسمان ہے(2)۔ یہ مہدوی نے ذکر کیا ہے۔

میں کہتا ہوں: بخاری میں شریک بن عبد اللہ بن ابی نمر سے مروی ہے فرمایا میں نے حضرت انس کو یہ فرماتے ہوئے سنا: وہ

1۔ سنن ترمذی، حدیث نمبر 3082، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ تفسیر طبری، جز 15، صفحہ 113

رات جس میں نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو کعبہ کی مسجد سے سیر کرائی گئی۔ اس حدیث میں ہے ”ہر آسمان میں انبیاء تھے“۔ آپ نے نام بیان کیے ان میں حضرت ادریس علیہ السلام کا دوسرے آسمان میں ہونے کا ذکر کیا۔ یہ وہم ہے صحیح یہ ہے کہ چوتھے آسمان پر تھے۔ اسی طرح ثابت بنانی نے حضرت انس بن مالک سے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے؛ یہ مسلم نے صحیح میں ذکر کیا ہے۔ حضرت مالک بن صعصعہ نے روایت کیا ہے فرمایا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جب مجھے آسمان کی طرف لے جایا گیا تو میں ادریس علیہ السلام کے پاس چوتھے آسمان میں آیا“ (1)۔ یہ بھی مسلم نے نقل کیا ہے حضرت ادریس علیہ السلام کو بلند کرنے کا سبب وہ ہے جو حضرت ابن عباس اور کعب وغیرہ نے کہا ہے: ایک دن وہ کسی کام کے لیے چلے تو انہیں سورج کی گرمی لگی تو انہوں نے کہا: یارب! میں ایک دن چلا ہوں (تو یہ حالت ہے) جو ایک دن میں پانچ سو سال اس کو اٹھائے گا اس کی کیا کیفیت ہوگی۔ اللہ اس سے اس کا بوجھ ہلکا کر دے یعنی سورج کے فلک پر متعین فرشتہ۔ حضرت ادریس نے کہا: اے اللہ! اس سے اس کا بوجھ ہلکا کر دے اور اس سے اس کی گرمی اٹھا لے۔ جب فرشتے نے صبح کی تو اس نے سورج کی خفت اور ایسا سایہ پایا جو وہ جانتا نہیں تھا۔ اس فرشتہ نے عرض کی: یارب! تو نے مجھے سورج کے اٹھانے کے لیے پیدا کیا تھا پھر یہ کیا فیصلہ فرمایا؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میرے بندے ادریس نے مجھ سے سوال کیا ہے کہ میں تجھ سے اس کے بوجھ اور اس کی گرمی میں تخفیف کر دوں تو میں نے اس کی دعا قبول کی ہے۔ اس فرشتے نے عرض کی: یارب! مجھے اور اسے جمع کر دے، میرے اور اس کے درمیان دوستی بنا دے۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتے کو اجازت دی حتی کہ وہ حضرت ادریس علیہ السلام کے پاس آیا۔ حضرت ادریس علیہ السلام نے اس سے پوچھا اور کہا: مجھے خبر دی گئی ہے کہ تو ملائکہ میں سے معزز فرشتہ ہے اور ملک الموت کے ہاں تیری دوسروں کی نسبت سے زیادہ عزت ہے، تم میری اس کے پاس سفارش کر دنا کہ وہ میری عمر میں ڈھیل دے دے تاکہ اللہ کا شکر اور عبادت زیادہ کروں۔ فرشتے نے کہا: اللہ تعالیٰ کسی نفس کو ڈھیل نہیں دیتا جب اس کی موت کا وقت آجاتا ہے۔ حضرت ادریس نے فرشتے سے کہا: مجھے یہ معلوم ہے لیکن یہ میرے نفس کے لیے اچھا ہوگا۔ پھر سورج کے فرشتے نے حضرت ادریس کو اپنے پَر کے اوپر اٹھایا اور آسمان کی طرف بلند کیا اور انہیں سورج کے مطلع کے پاس اُتارا پھر فرشتے نے ملک الموت سے کہا: بنی آدم سے میرا ایک دوست ہے اس نے تیری بارگاہ میں میری سفارش پیش کی ہے کہ تو اس کی عمر میں ڈھیل دے۔ ملک الموت نے کہا: یہ میرے بس میں نہیں اگر تو پسند کرتا ہے کہ وہ جان لے کہ وہ کب فوت ہوگا تو میں اسے یہ بتا دیتا ہوں۔ اس نے کہا: ٹھیک ہے یہی بتا دو۔ پھر ملک الموت نے اپنے دیوان میں دیکھا تو فرمایا: تو مجھ سے ایسے انسان کے بارے سوال کر رہا ہے میں اسے نہیں دیکھتا کہ وہ کبھی فوت ہوگا فرشتے نے کہا: وہ کیسے؟ ملک الموت نے کہا: میں نے اس کی موت کو نہیں پایا مگر سورج کے طلوع ہونے کے پاس۔ فرمایا: میں تیرے پاس آیا ہوں جبکہ ادریس کو میں اسی جگہ چھوڑ آیا ہوں۔ ملک الموت نے کہا: تم جاؤ میں تجھے نہیں دیکھتا مگر یہ کہ تو اسے فوت شدہ پائے گا۔ اللہ کی قسم! ادریس علیہ السلام کی عمر سے کچھ بھی باقی نہیں ہے۔ وہ فرشتہ واپس آیا تو حضرت ادریس علیہ السلام کو فوت شدہ پایا۔ سدی نے کہا: ایک دن حضرت ادریس علیہ السلام سوئے ہوئے تھے تو انہیں سورج کی گرمی بڑی

1۔ تفسیر طبری، جز 15، صفحہ 114

شدید لگی وہ اٹھے تو وہ اس کی وجہ سے تکلیف میں تھے۔ عرض کی: اے اللہ! سورج کے فرشتے سے سورج کی گرمی میں تخفیف کر اور اس کی اس کے بوجھ پر مدد فرما کیونکہ وہ گرم آگ برداشت کرتا ہے سورج کے فرشتے نے صبح کی تو اس کے لیے نور کی ایک کرسی لگائی گئی تھی اور اس کے پاس ستر ہزار فرشتے دائیں طرف اور ستر ہزار فرشتے بائیں طرف اس کی خدمت کرتے تھے اور اس کا حکم اور عمل بجالاتے تھے۔ سورج کے فرشتے نے کہا: یارب! یہ میرے لیے کہاں سے آیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تیرے لیے بنی آدم میں سے ایک نے دعا کی ہے جسے ادریس کہا جاتا ہے۔ پھر کعب کی حدیث کی طرح ذکر کیا ہے فرمایا: سورج کے فرشتے نے حضرت ادریس سے کہا: تیری کیا حاجت ہے؟ حضرت ادریس نے کہا: میری خواہش ہے کہ میں جنت کو دیکھوں۔ فرمایا: اس فرشتے نے آپ کو اپنے پروں پر اٹھایا پھر اڑ گیا جب وہ چوتھے آسمان میں تھا تو اس کی ملاقات ملک الموت سے ہوئی وہ آسمان میں دائیں بائیں دیکھ رہا تھا۔ سورج کے فرشتے نے ملک الموت پر سلام کیا اور کہا: اے ادریس یہ ملک الموت ہے پس تو اس پر سلام کر۔ ملک الموت نے کہا: سبحان اللہ! تو اسے یہاں کس لیے لایا ہے؟ اس نے کہا: میں نے اسے اس لیے بلند کیا ہے تاکہ اسے جنت دکھاؤں فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں ادریس علیہ السلام کی روح چوتھے آسمان پر قبض کروں۔ میں نے کہا: یارب! ادریس چوتھے آسمان پر کیسے ہوگا؟ پس میں چوتھے آسمان پر اُترا تو وہ تمہارے ساتھ تھے پس اس کی روح قبض کی اور جنت کی طرف اسے بلند کیا۔ ملائکہ نے آپ کے جسم کو چوتھے آسمان میں دفن کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَّ رَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا کا یہی مفہوم ہے۔ وہب بن منبہ نے کہا: حضرت ادریس علیہ السلام کی ہر روز عبادت میں سے اس کی مثل بلند ہوتا تھا جتنا کہ اہل زمین کے لیے اس زمانہ میں بلند ہوتا تھا۔ ملائکہ نے اس پر تعجب کیا اور ملک الموت کو آپ کی ملاقات کا شوق ہوا۔ ملک الموت نے آپ کی زیارت کے لیے اللہ تعالیٰ سے اجازت طلب کی تو اللہ تعالیٰ نے ملک الموت کو اجازت مرحمت فرمائی۔ ملک الموت انسانی شکل میں آپ کے پاس آئے۔ حضرت ادریس علیہ السلام دن کو روزہ رکھتے تھے جب افطار کا وقت ہوتا تھا تو ملک الموت کو کھانے پر بلاتے تھے تو وہ کھانے سے انکار کرتا تھا یہ اس کے ساتھ تین دن کیا پھر ادریس نے عجیب سمجھا اور اس سے پوچھا: تو کون ہے؟ فرمایا: میں ملک الموت ہوں۔ میں نے اپنے رب سے اجازت طلب کی تھی کہ میں آپ سے ملوں تو اس نے مجھے اجازت دی۔ حضرت ادریس نے کہا: مجھے آپ سے ایک کام ہے۔ حضرت ملک الموت نے کہا: وہ کیا ہے؟ فرمایا: تو میری روح قبض کر لے۔ اللہ تعالیٰ نے ملک الموت کو وحی فرمائی کہ اس کی روح قبض کر لے۔ ملک الموت نے اس کی روح قبض کر لی۔ ایک لمحہ بعد اللہ تعالیٰ نے اس کی روح لوٹا دی۔ ملک الموت نے حضرت ادریس سے کہا: تیری روح قبض کرنے میں کیا فائدہ ہوا؟ فرمایا: تاکہ میں موت کی تکلیف چکھ لوں اور میں اس کے لیے زیادہ استعداد حاصل کروں۔ پھر حضرت ادریس نے ملک الموت سے کہا: مجھے تجھ سے ایک اور کام ہے۔ ملک الموت نے کہا: وہ کیا ہے؟ فرمایا تو مجھے آسمان کی طرف بلند کرتا کہ میں جنت اور دوزخ کو دیکھوں۔ اللہ تعالیٰ نے ملک الموت کو اذن دیا کہ اسے آسمانوں کی طرف لے جائے۔ حضرت ادریس نے آگ دیکھی تو غشی طاری ہوگئی جب افاقہ ہوا تو کہا: مجھے جنت دکھاؤ۔ وہ اسے جنت میں لے گئے پھر حضرت ادریس سے ملک الموت نے کہا: جنت سے باہر نکلو تاکہ میں تجھے اپنی جگہ پر لوٹا دوں تو حضرت ادریس نے ایک درخت کو پکڑ لیا اور کہا: میں جنت سے نہیں

نکلوں گا۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان کے درمیان فیصلہ کے لیے ایک فرشتہ بھیجا جس نے فیصلہ کرنا تھا اس فرشتے نے حضرت ادریس سے پوچھا: تم جنت سے کیوں نہیں نکلتے؟ حضرت ادریس نے کہا: کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کُلُّ نَفْسٍ ذَآىِٕقَةُ الْمَوْتِ (آل عمران: 185) (ہر نفس نے موت کا ذائقہ چکھنا ہے) اور میں موت کا ذائقہ چکھ چکا ہوں اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ اِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا تم میں سے ہر ایک نے دوزخ پر وارد ہونا ہے۔ اور میں اس پر وارد ہو چکا ہوں اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ مَا هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِیْنَ ۝ (الحجر) وہ اس (جنت) سے نکلنے والے نہیں؟ پھر میں اس سے کیسے نکلوں؟ اللہ تعالیٰ نے ملک الموت سے فرمایا: میرے اذن سے وہ جنت میں داخل ہوئے تھے اور میرے حکم سے ہی باہر نکلیں گے، پس حضرت ادریس علیہ السلام جنت میں زندہ ہیں اور وَّ رَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِیًّا ۝ سے یہی مراد ہے۔ النحاس نے کہا: ادریس کا قول: وَ مَا هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِیْنَ۔ ہو سکتا ہے اللہ تعالیٰ نے حضرت ادریس کو یہ سکھایا ہو پھر اس کو قرآن میں نازل کیا ہو۔ وہب بن منبہ نے کہا: حضرت ادریس جنت میں کبھی کھاتے پیتے ہیں اور کبھی ملائکہ کے ساتھ آسمان میں اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔

اُولٰٓىِٕكَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ مِّنَ النَّبِیّٖنَ مِنْ ذُرِّیَّةِ اٰدَمَ ۗ وَ مِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ ۫ وَّ مِنْ ذُرِّیَّةِ اِبْرٰهِیْمَ وَ اِسْرَآءِیْلَ ۫ وَ مِمَّنْ هَدَیْنَا وَ اجْتَبَیْنَا ؕ اِذَا تُتْلٰى عَلَیْهِمْ اٰیٰتُ الرَّحْمٰنِ خَرُّوْا سُجَّدًا وَّ بُكِیًّا ۝

''یہ وہ (مقدس ہستیاں) ہیں جن پر انعام فرمایا اللہ تعالیٰ نے انبیاء (کرام کے زمرہ) سے یہ آدم کی اولاد سے تھے اور بعض ان کی اولاد جن کو ہم نے سوار کیا تھا (کشتی میں) نوح کے ساتھ اور بعض ابراہیم اور یعقوب کی اولاد سے تھے اور ان میں سے جنہیں ہم نے ہدایت دی اور چن لیا، جب پڑھی جاتی ہیں ان کے سامنے رحمٰن کی آیتیں تو وہ گر پڑتے ہیں سجدہ کرتے ہوئے اور (زار و قطار) روتے ہوئے''۔

اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اُولٰٓىِٕكَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ مِّنَ النَّبِیّٖنَ مِنْ ذُرِّیَّةِ اٰدَمَ اس سے مراد صرف حضرت ادریس علیہ السلام ہیں۔ وَ مِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ سے مراد صرف حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ وَّ مِنْ ذُرِّیَّةِ اِبْرٰهِیْمَ سے مراد حضرت اسماعیل، حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب علیہ السلام ہیں اور (اسرائیل) کی ذریت سے مراد حضرت موسیٰ، حضرت ہارون، حضرت زکریا، حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام ہیں۔ حضرت ادریس اور حضرت نوح کو حضرت آدم علیہ السلام سے قرب کا شرف تھا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے حضرت نوح علیہ السلام سے قرب کا شرف تھا اور حضرت اسماعیل، حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب کو حضرت ابراہیم سے قرب کا شرف تھا۔ وَ مِمَّنْ هَدَیْنَا، یعنی جن کو ہم نے اسلام کی طرف ہدایت دی۔ وَ اجْتَبَیْنَا اور ہم نے ایمان کے لیے چن لیا۔ اِذَا تُتْلٰى عَلَیْهِمْ اٰیٰتُ الرَّحْمٰنِ، شبل بن عباد مکی نے یتلی مذکر کا صیغہ پڑھا ہے کیونکہ فاعل مونث غیر حقیقی ہے اور فعل اور فاعل کے درمیان فاصلہ بھی ہے۔ خَرُّوْا سُجَّدًا وَّ بُكِیًّا ۝ ان کا وصف بیان فرمایا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے لیے خشوع کا اظہار کرنے والے ہیں اور اس کی بارگاہ میں رونے

والے ہیں۔ یہ الفاظ سورۂ سبحان میں گزر چکے ہیں۔ کہا جاتا ہے: بکی یبکی بکاء وبکی وبکیاً۔ مگر خلیل نے کہا: جب تھوڑا رونا ہو تو وہ حزن کی مثل ہے یعنی اس کے ساتھ آواز نہ ہو جیسے شاعر نے کہا:

بکت عینی وحُقَّ لها بکا ها وما یغنی البکاءُ ولا العَویلُ

اور سُجَّدًا، پر نصب حال کی وجہ سے ہے اور بُکِیًّا اس پر معطوف ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ اس آیت میں دلیل ہے کہ رحمٰن کی آیات کا دلوں پر اثر ہے۔ حسن نے کہا: اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُ الرَّحْمٰنِ خَرُّوْا سُجَّدًا وَّ بُكِيًّا﴿۵۸﴾ یعنی نماز میں جب ان پر آیات تلاوت کی جاتی ہیں تو وہ سجدہ کرتے ہوئے اور روتے ہوئے گر پڑتے ہیں۔ اصم نے کہا: اٰيٰتُ الرَّحْمٰنِ سے مراد وہ کتب ہیں جو اس کی توحید اور اس کی محبتوں کو متضمن ہیں اور وہ ان کی تلاوت کے وقت سجدہ کرتے تھے اور ان کے ذکر کے وقت روتے تھے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ اس سے مراد خاص قرآن ہے اور وہ اس کی تلاوت کے وقت سجدہ کرتے تھے اور روتے تھے۔ الکیانے کہا: اس آیت میں حضرت ابن عباس کے قول سے اس شخص کے قول کی دلیل ہے جو کہتا ہے کہ قرآن وہ ہے جو تمام انبیاء پر پڑھا جاتا تھا لیکن اگر اس طرح ہوتا تو رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم اس کے انزال کے ساتھ مختص نہ ہوتے۔

مسئلہ نمبر 3۔ ابو بکر رازی نے اس آیت سے حجت پکڑی ہے کہ قاری اور سننے والے پر قرآن کے سجدے واجب ہیں۔ الکیانے کہا: یہ بعید ہے کیونکہ یہ وصف تو الله تعالیٰ کی تمام آیات کو شامل ہے اور سجود کو بکاء (رونے) کے ساتھ ملایا گیا ہے اور اس سے انبیاء کا طریقہ ظاہر ہوا ہے کہ وہ الله تعالیٰ کی اور اس کی آیات کی تعظیم کرتے تھے۔ اس میں مخصوص آیت پڑھتے وقت سجدہ کے وجوب پر کوئی دلالت نہیں ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ علماء نے فرمایا: جو سجدہ کی آیت پڑھے وہ آیات کے مطابق اس سجدہ میں دعا مانگے مثلاً اگر سورۃ السجدہ، الم تنزیل آیت سجدہ پڑھے تو یہ دعا مانگے: اللهم أجعلني من الساجدين لوجهك المسبحين بحمدك وأعوذبك أن أكون من المستكبرين عن أمرك۔ اے الله! مجھے اپنی رضا کے لیے سجدہ کرنے والوں، اپنی حمد کے ساتھ تسبیح کرنے والوں سے بنادے اور میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں کہ میں تیرے حکم سے تکبر کرنے والوں سے ہو جاؤں۔ اور اگر سورۂ سبحان کی آیت سجدہ پڑھے تو یہ دعا مانگے: اللهم أجعلني من الباكين اليك الخاشعين لك۔ اے الله! مجھ اپنی بارگاہ میں رونے والوں اور خشوع کرنے والوں سے بنادے۔ اگر یہ آیت پڑھے تو یہ دعا مانگے: اللهم أجعلني من عبادك المنعم عليهم المهديين الساجدين لك الباكين عند تلاوة آياتك۔ اے الله! مجھے اپنے انعام یافتہ، ہدایت یافتہ اور اپنی بارگاہ میں سجدہ کرنے والے لوگوں سے (اور) آیات کی تلاوت کے وقت رونے والوں سے بنادے۔

فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا﴿۵۹﴾ اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ شَيْـًٔا﴿۶۰﴾ جَنّٰتِ عَدْنِ ِالَّتِيْ وَعَدَ الرَّحْمٰنُ عِبَادَهٗ بِالْغَيْبِ ۭ اِنَّهٗ كَانَ وَعْدُهٗ مَاْتِيًّا﴿۶۱﴾

لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا اِلَّا سَلٰمًا ۚ وَ لَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيْهَا بُكْرَةً وَّ عَشِيًّا ۝ تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْ نُوْرِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَنْ كَانَ تَقِيًّا ۝

''پس جانشین بنے ان کے بعد وہ ناخلف جنہوں نے ضائع کیا نمازوں کو اور پیروی کی خواہشات (نفسانی) کی سو وہ دوچار ہونگے اپنی نافرمانی (کی سزا) سے، مگر جو تائب ہوئے اور ایمان لائے اور نیک عمل کیے تو یہ لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان پر ذرا ظلم نہیں کیا جائے گا۔ سدا بہار چمن جن کا وعدہ (خداوند) رحمٰن نے اپنے بندوں سے غیب میں کیا ہے یقیناً اس کا وعدہ پورا ہو کر رہنے والا ہے۔ نہیں سنیں گے جنت میں کوئی لغو بات بجز سلامت رہو کی دعائیہ صدا اور انہیں ان کا رزق ملے گا وہاں ہر صبح و شام۔ یہ وہ جنت ہے جس کا ہم وارث بنائیں گے اپنے بندوں سے (صرف) اس کو جو متقی ہوگا''۔

اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اس سے مراد بری اولاد ہے۔ ابوعبیدہ نے کہا: ہمیں حجاج نے بیان کیا انہوں نے ابن جریج سے انہوں نے مجاہد سے روایت کیا ہے فرمایا: یہ قیامت کے قیام کے وقت ہوگا اور اس امت کے نیک لوگوں کے چلے جانے کے وقت ہوگا، لوگ گلیوں میں زنا کریں گے۔ خلف کے متعلق کلام سورۃ الاعراف میں گزر چکی ہے۔ اعادہ کی ضرورت نہیں۔

مسئلہ نمبر 2۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ۔ حضرت عبداللہ اور حسن نے أضاعوا الصلوات، پڑھا ہے یہ مذمت ہے۔ اور نص ہے کہ نماز کا ضائع کرنا ان کبائر میں سے ہے جو انسان کو ہلاکت میں ڈالتے ہیں۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ حضرت عمر نے فرمایا: جس نے نماز کو ضائع کیا وہ اسکے علاوہ احکام شرع کو زیادہ ضائع کرنے والا ہوگا۔ علماء کا اختلاف ہے کہ اس آیت سے کون مراد ہیں؟ مجاہد نے کہا: نصاریٰ مراد ہیں، جو یہود کے بعد آئے۔ محمد بن کعب قرظی اور مجاہد اور عطا نے کہا: اس سے مراد آخر زمانہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت سے آنے والے لوگ ہیں (1) یعنی اس امت سے ہوں جن کی یہ صفت ہوگی، نصاریٰ مراد نہیں ہیں۔ اور علماء کا نماز کو ضائع کرنے کے بارے میں بھی اختلاف ہے۔ قرظی نے کہا: اس سے مراد نماز کا انکار کرنا ہے۔ قاسم بن مخیمرہ اور حضرت عبداللہ بن مسعود نے کہا: اس کو وقت پر ادا نہ کرنا اور اس کے حقوق کو قائم نہ کرنا ہے۔ یہ قول صحیح ہے کیونکہ جب نماز وقت پر ادا کی جائے اور آداب وحقوق سے خالی ہو تو وہ صحیح نہیں ہوتی کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کو فرمایا جس نے نماز پڑھی اور آیا اور آپ کو سلام پیش کیا: ''واپس جا اور نماز پڑھ تو نے نماز نہیں پڑھی'' (2) یہ تین مرتبہ فرمایا۔ اس حدیث کو مسلم نے نقل کیا ہے۔ حضرت حذیفہ نے ایک شخص کو فرمایا جس نے نماز میں کوتاہی کی تھی: تو کتنے عرصہ سے یہ نماز پڑھ رہا ہے؟ اس نے کہا: چالیس سال سے۔ حضرت حذیفہ نے فرمایا: تو نے نماز نہیں پڑھی

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 22

2۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، وجوب قرأۃ الفاتحۃ فی کل رکعۃ، جلد 1، صفحہ 170

اگر تو اس طرح نماز پڑھتے ہوئے مر گیا تو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر نہیں مرے گا، پھر فرمایا: انسان کو نماز مختصر پڑھنی چاہیے مکمل پڑھے اور اچھے انداز میں پڑھے۔ اس حدیث کو بخاری نے نقل کیا ہے اور یہ لفظ نسائی کے ہیں۔ ترمذی میں حضرت ابو مسعود انصاری سے روایت کیا ہے فرمایا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ نماز جائز نہیں ہوتی جس میں انسان سیدھا نہیں ہوتا یعنی رکوع اور سجود میں پیٹھ کو سیدھا نہیں کرتا ہے (1)۔ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ اور اہل علم صحابہ اور تابعین کا اس پر عمل ہے ان کا نظریہ ہے کہ آدمی رکوع وسجود میں اپنی پیٹھ کو سیدھا کرے۔ امام شافعی، امام احمد اور اسحاق نے کہا: جو اپنی پیٹھ رکوع اور سجود میں سیدھی نہیں کرتا اس کی نماز فاسد ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یہ نماز منافق کی نماز ہے سورج کو تاڑتے ہوئے بیٹھا رہتا ہے حتی کہ جب سورج شیطان کے سینگوں کے درمیان ہو جاتا ہے تو کھڑا ہوتا ہے اور چار ٹھونگیں مارتا ہے وہ نماز میں اللہ کا ذکر نہیں کرتا مگر تھوڑا (2)'' یہ مذمت ہے اس شخص کی جو ایسا کرتا ہے۔ فروہ بن خالد بن سنان نے کہا: ایک دفعہ ضحاک کے ساتھیوں نے نماز عصر میں امیر کا بہت دیر تک انتظار کیا حتی کہ سورج غروب ہونے کے قریب پہنچ گیا۔ ضحاک نے اس وقت یہ آیت پڑھی پھر فرمایا: اللہ کی قسم! نماز کو ترک کرنا میرے نزدیک اسے ضائع کرنے سے بہتر ہے۔ بہر حال اس باب میں حتمی قول یہ ہے کہ جو نماز کا مکمل وضو نہیں کرتا اور رکوع وسجود صحیح نہیں کرتا وہ نماز کی حفاظت کرنے والا نہیں اور جس نے نماز کی حفاظت نہیں کی اس نے اسے ضائع کر دیا اور جس نے نماز کو ضائع کیا وہ دوسرے احکام شرع کو زیادہ ضائع کرنے والا ہوگا۔ حسن نے کہا: نماز کے ضیاع سے مراد یہ ہے کہ انہوں نے مساجد کو معطل کر دیا اور اپنے دنیا کے کاموں اور اسباب میں مشغول ہو گئے۔ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ یعنی لذات اور معاصی کی پیروی کی۔

مسئلہ نمبر 3۔ ترمذی اور ابو داؤد نے انس بن حکیم ضبی سے روایت کیا ہے (3) کہ وہ مدینہ طیبہ آئے تو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ملے انہوں نے کہا: اے نوجوان! کیا میں تجھے ایسی حدیث بیان نہ کروں شاید اللہ تعالیٰ تجھے اس سے نفع دے؟ میں نے کہا: کیوں نہیں (ضرور بتائیے) فرمایا: قیامت کے روز لوگوں کے اعمال میں سے جس کا پہلے محاسبہ ہوگا وہ نماز ہے۔ اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرمائے گا حالانکہ وہ زیادہ جانتا ہے: میرے بندے کی نماز دیکھو اس نے اس کو مکمل کیا یا کوتاہی کی اگر وہ نماز مکمل ہوگی تو اس کے لیے مکمل لکھی جائے گی، اگر اس میں کچھ کمی ہوگی تو ارشاد ہوگا: دیکھو کیا میرے بندے کے نوافل ہیں، اگر اس کے نوافل ہوں گے تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا: میرے بندے کے لیے اس کے نوافل سے اس کے فرائض کو مکمل کر دو پھر اس پر دوسرے اعمال کا مؤاخذہ ہوگا۔ یونس نے کہا: میرا گمان ہے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے: یہ ابو داؤد کے الفاظ ہیں (4) فرمایا: ہمیں موسیٰ بن اسماعیل نے بیان کیا انہوں نے کہا ہمیں حماد نے بیان

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 124۔ ایضاً حدیث نمبر 729۔ سنن ترمذی حدیث نمبر 245، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد، استحباب التبکیر بالعصر، جلد 1، صفحہ 225

3۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، قول النبی کل صلوٰۃ لایتمہا صاحبہا، جلد 1، صفحہ 126

4۔ سنن ابی داؤد باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم، حدیث نمبر 733۔ ابن ماجہ، باب ماجاء فی اول مایحاسب بہ العبد، حدیث نمبر 1414، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کیا انہوں نے تمیم داری سے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی مفہوم روایت کیا ہے پھر فرمایا: ''زکوۃ بھی اس کی مثل ہے (1) پھر اس کے مطابق اعمال کا مواخذہ ہوگا''۔ اس حدیث کو نسائی نے ہمام سے انہوں نے حسن سے انہوں نے حریث بن قبیصہ سے انہوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے فرمایا: میں نے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ ''قیامت کے روز بندے کا جس چیز کے متعلق محاسبہ کیا جائے گا وہ نماز ہے۔ اگر نماز درست ہوگی تو وہ شخص کامیاب وکامران ہو جائے گا اگر نماز کا معاملہ خراب ہوگا تو وہ خائب وخاسر ہوگا''۔ ہمام نے کہا: میں نہیں جانتا یہ قتادہ کے کلام سے ہے یا روایت سے ہے، اگر اس کے فرائض میں سے کچھ کمی ہوگی تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا: دیکھو کیا میرے بندے کے لیے کوئی نفل ہے پھر فرائض کی کمی نفل سے پوری کی جائے گی پھر تمام اعمال اس کے مطابق ہوں گے۔ ابو العوام نے اس کی مخالفت کی۔ انہوں نے یہ قتادہ سے انہوں نے حسن سے انہوں نے ابو رافع سے انہوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قیامت کے روز بندے کا سب سے پہلے جس چیز کا محاسبہ ہوگا وہ اس کی نماز ہے اگر وہ مکمل پائی جائے گی تو وہ مکمل لکھی جائے گی، اگر اس میں کچھ کمی ہوگی تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا: دیکھو کیا تم اس کے لیے نفل پاتے ہو فرائض نماز میں سے جو کمی ہوگی اس کے نفل سے مکمل کی جائے گی پھر تمام اعمال اس کے مطابق جاری ہوں گے (2)۔ نسائی نے کہا ہمیں اسحاق بن ابراہیم نے بتایا انہوں نے کہا ہمیں نضر بن شمیل نے بتایا فرمایا ہمیں حماد بن سلمہ نے خبر دی انہوں نے ازرق بن قیس سے انہوں نے یحییٰ بن یعمر سے انہوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے انہوں نے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے فرمایا: ''قیامت کے روز سب سے پہلے بندے کے جس عمل کا محاسبہ کیا جائے گا وہ اس کی نماز ہے اگر نماز درست ہوگی تو وہ شخص کامیاب وکامران ہو جائے گا اگر نماز کا معاملہ خراب ہو گیا تو وہ خائب وخاسر ہوگا'' (3)۔ ورنہ اللہ تعالیٰ فرمائے گا میرے بندے کے بارے میں دیکھو کیا اس کے نفل ہیں اگر نفل ہوئے تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا اس کے فرائض کی کمی کو پورا کر دو۔ ابو عمر بن عبد البر نے کتاب التمہید میں فرمایا: نوافل سے فرائض کا مکمل کرنا اس کے لیے ہوگا جو فرض کو بھول گیا ہوگا اور اسے ادا نہ کیا ہوگا یا اس کا رکوع وسجود بہتر ادا نہ کیا ہوگا اور اسے اس کی قدر معلوم نہ ہوگی لیکن جس نے نماز کو جان بوجھ کر ترک کیا ہوگا یا پہلے بھولا ہوگا پھر اسے یاد آیا ہوگا لیکن جان بوجھ کر پھر ادا نہ کیا ہوگا اور فرض کی ادائیگی کو چھوڑ کر نوافل میں مشغول ہوا ہوگا جبکہ فرض اسے یاد بھی ہوگا تو اس کے لیے نوافل سے فرض کو مکمل نہیں کیا جائے گا۔ اس کے بارے میں شامیین کی حدیث سے ایک منکر حدیث مروی ہے جس کو محمد بن حمیر نے عمرو بن قیس سکونی سے انہوں نے عبد اللہ بن قرط سے انہوں نے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے فرمایا: ''جس نے کوئی نماز پڑھی اور اس میں رکوع وسجود مکمل نہ کیا، اس میں اس کی تسبیحات زیادہ کہی گئیں حتی کہ نماز مکمل کی جائے گی۔ ابو عمر نے کہا: یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے محفوظ نہیں ہے مگر اسی طریق سے اور یہ قوی نہیں اور اگر یہ صحیح ہو تو اس کا معنی یہ ہوگا کہ وہ نماز سے باہر ہو گیا اس نے اپنے خیال میں نماز کو مکمل کیا جبکہ حکم میں مکمل نہ تھی۔

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، قول النبی کل صلوٰۃ لا یتمہا صاحبہا، جلد 1، صفحہ 126۔ ایضاً حدیث نمبر 733، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن نسائی، کتاب الصلوٰۃ، المحاسبۃ علی الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 82 3۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 81

میں کہتا ہوں: انسان کے لیے مناسب ہے کہ وہ فرض اور نفل اچھے طریقے سے ادا کرے تا کہ اس کے لیے نفل ہوں جو اس کے فرض سے زائد ہوں اور وہ اپنے رب کا ان کے ذریعے قرب حاصل کرے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''میرا بندہ نوافل کے ذریعے میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے حتی کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں'' (1) (الحدیث) رہا یہ کہ جب اس کے لیے نفل ہوگا اس کے ساتھ فرض کو پورا کیا جائے گا تو اس کا حکم معنی میں فرض کا حکم ہوگا اور جو فرائض اچھی طرح نہیں پڑھتا وہ نفل بھی اچھی طرح نہیں پڑھے گا یقیناً لوگوں سے نوافل میں زیادہ نقصان اور خلل ہوتا ہے کیونکہ ان کے نزدیک ان کی زیادہ اہمیت نہیں ہوتی اور اس میں وہ سستی کرتے ہیں حتی کہ گویا اس کو کچھ شمار نہیں کرتے۔ اللہ تعالیٰ کی قسم! جس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ پایا جاتا ہے اس کے متعلق علم کا گمان کیا جاتا ہے اس کے نفل اسی طرح ہوا کرتے ہیں بلکہ فرض کو بھی مرغ کے دانہ چگنے کی طرح ادا کرتا ہے کیونکہ حدیث کی معرفت نہیں ہوتی پھر جہال کی کیا حالت ہوگی جو کچھ جانتے بھی نہیں؟ علماء نے فرمایا: رکوع وسجود جائز نہیں ہوتا اور رکوع کے بعد وقوف جائز نہیں ہوتا اور دو سجدوں کے درمیان جلوس جائز نہیں ہوتا حتی کہ اعتدال کے ساتھ رکوع کرے، وقوف کرے، سجدہ کرے اور بیٹھے۔ یہ اثر میں صحیح ہے اسی طرح جمہور اور اہل نظر کا نظریہ ہے؛ یہ ابن وہب اور ابو مصعب کی امام مالک سے روایت ہے: یہ معنی سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ جب معاملہ اس طرح ہو تو ایسے نوافل کے ساتھ فرض کی کمی کو کیسے پورا کیا جائے گا بلکہ یہ تمام غیر صحیح اور غیر مقبول ہیں کیونکہ یہ غیر مطلوب طریقہ پر واقع ہوا ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اس ارشاد کے تحت مروی ہے کہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے پختہ مکان بنائے، قابل دید سواری پر سوار ہوا اور مشہور اور شہرت والا لباس پہنا۔

میں کہتا ہوں: الشَّهَوٰتِ سے مراد وہ تمام چیزیں ہیں جو انسان کے موافق ہوتی ہیں انسان ان کی خواہش کرتا ہے اور وہ اس کے مناسب ہوتی ہیں اور انسان ان سے نہیں بچتا ہے۔ صحیح حدیث میں ہے: ''جنت کو تکالیف کے ساتھ گھیرا گیا ہے اور دوزخ کو شہوات کے ساتھ گھیرا گیا ہے (2)'' اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جو مروی ہے وہ اس کا جزء ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا ﴿۵۹﴾ ابن زید نے کہا: غیا سے مراد شر یا گمراہی یا خسارہ ہے۔ شاعر نے کہا ہے:

فمن يلق خيرا يحمد الناس أمره ومن يغو لا يعدم على الغيّ لائما

حضرت عبد اللہ بن مسعود نے فرمایا: جہنم میں ایک وادی ہے (3)۔ اہل لغت کے نزدیک تقدیر عبارت اس طرح ہے: فسوف يلقون هذا الغی۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ﴿۶۸﴾ (الفرقان) اظہر یہ ہے کہ الغی وادی کا نام ہے، اس کو یہ نام اس لیے دیا گیا ہے کہ گمراہ لوگ اس کی طرف جائیں گے۔ کعب نے کہا: آخر زمانہ میں ایک قوم ظاہر ہو گی ان کے ہاتھوں میں گائے کے دموں کی طرح کوڑے ہوں گے پھر یہ تلاوت کیا: فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا۔ یعنی وہ جہنم میں ہلاکت وگمراہی پائیں گے، ان سے یہی مروی ہے کہ غی جہنم میں ایک وادی ہے جہنم کی سب سے گہری وادی ہے اور انتہائی

1۔ صحیح بخاری، کتاب الرقاق، التواضع، جلد 2، صفحہ 923

2۔ صحیح بخاری، کتاب الرقاق، حجبت النار بالشهوات، جلد 2، صفحہ 960

3۔ تفسیر طبری، جز 15-16، صفحہ 117

گرم وادی ہے اس میں ایک کنواں ہے جس کو الہیم کہا جاتا ہے، جب جہنم بجھتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کنویں کو کھول دیتا ہے پس جہنم اس کے ساتھ بھڑک اٹھتی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: غی جہنم میں ایک وادی ہے اور جہنم کی دوسری وادیاں اس کی گرمی سے پناہ مانگتی ہیں، اللہ تعالیٰ نے اس وادی کو اس زانی کے لیے تیار کیا ہے جو زنا پر اصرار کرتا ہے اور اس شرابی کے لیے تیار کیا ہے جو ہمیشہ شراب پیتا ہے اور جھوٹ کی گواہی دینے والوں کے لیے تیار کیا ہے اور اس عورت کے لیے تیار کیا ہے جس نے اپنے خاوند پر ایسے بچے کو داخل کیا جو اس سے نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِلَّا مَنْ تَابَ، یعنی نماز کے ضائع کرنے اور شہوات کی پیروی کرنے سے جس نے توبہ کی اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی طرف لوٹ آیا۔ وَ اٰمَنَ، اللہ تعالیٰ پر ایمان لایا۔ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ ابوجعفر، شیبہ، ابن کثیر، ابن محیصن، ابوعمرو، یعقوب اور ابوبکر نے یَدْخُلُوْنَ خاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ وَ لَا یُظْلَمُوْنَ شَیْـًٔا۝ ان کے اعمال صالحہ میں سے کچھ کمی نہیں کی جائے گی مگر ان کے لیے ہر نیکی کے بدلے دس سے لیکر سات سو تک نیکیاں لکھی جائیں گی۔ جَنّٰتِ عَدْنِ یہ الجنة سے بدل ہے اس لیے منصوب ہے۔ ابواسحاق زجاج نے کہا: جَنّٰتِ عَدْنِ متبدا کی حیثیت سے مرفوع بھی جائز ہے۔ ابو حاتم نے کہا: اگر خط (کتابت) نہ ہوتا تو یہ جنة عدن ہوتا کیونکہ اس سے پہلے یدخلون الجنة ہے۔ الَّتِیْ وَعَدَ الرَّحْمٰنُ عِبَادَهٗ بِالْغَیْبِ، یعنی جس نے رحمٰن کی عبادت کی اور غیب میں کیے گئے عہد کی حفاظت کی۔ بعض نے فرمایا: جنت پر ایمان لائے جبکہ انہوں نے اسے دیکھا نہیں۔ اِنَّهٗ كَانَ وَعْدُهٗ مَاْتِیًّا۝ مَاْتِیًّا۔ الاتیان سے مفعول کا صیغہ ہے۔ ہر وہ چیز جو تجھ تک پہنچتی ہے تو اس تک پہنچتا ہے تو کہتا ہے: اتت علی ستون سنة واتیت علی ستین سنة۔ مجھ پر ساٹھ سال آئے اور میں ساٹھ سال پر آیا۔ وصل الی من فلان خیر وصلت منه الی خیر مجھے فلاں کی طرف سے خیر پہنچی اور اس کی طرف سے خیر کو پہنچا، دونوں کا ایک معنی ہے۔ قتبی نے کہا: مَاْتِیًّا بمعنی آتٍ ہے یہ مفعول بمعنی فاعل ہے اور ماتیا مہموز ہے کیونکہ یہ اتی یاتی سے آیا ہے اور جنہوں نے ہمزہ میں تخفیف کی اس نے اس کو الف بنایا ہے۔ طبری نے کہا: الوعد سے یہاں الموعد مراد ہے اور وہ جنت ہے یعنی جنت میں اس کے اولیاء آئیں گے۔ لَا یَسْمَعُوْنَ فِیْهَا لَغْوًا۔ اور جنت میں لغویات نہیں سنیں گے۔ اللغو کا معنی باطل اور فحش کلام ہے اور فضول، بے مقصد بات ہے، اسی سے حدیث ہے: "جب تو اپنے ساتھی کو جمعہ کے دن کہے: انصت (خاموش) جبکہ امام خطبہ دے رہا ہو تو تو نے لغوبات کی" (1)۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی لغت میں یہ لغیت ہے (جبکہ پہلی حدیث میں لغوت ہے معنی دونوں کا ایک ہے واوی اور یائی ہونے میں فرق ہے) جیسا کہ شاعر نے کہا:

وَرَبِّ اَسْرَابِ حَجِیْجٍ کُظَّمِ عن اللَّغَا وَرَفَثِ التَّکَلُّمِ

حضرت ابن عباس نے فرمایا: اللغو ہر وہ بات ہوتی ہے جس میں اللہ تعالیٰ کا ذکر نہ ہو یعنی جنتیوں کی جنت میں کلام الحمد للہ اور سبحان اللہ ہوگی۔ اِلَّا سَلٰمًا۔ لیکن وہ سلاما سنیں گے، یہ مستثنیٰ منقطع ہے یعنی وہ ایک دوسرے کو سلام کریں

1۔ صحیح بخاری، کتاب الجمعة، الانصات یوم الجمعة والامام یخطب، جلد 1، صفحہ 128،127

گے اور فرشتے کا ان پر سلام ہوگا؛ یہ مقاتل وغیرہ کا قول ہے۔ سلام خیر کا جامع اسم ہے اس کا معنی ہے وہ اس میں نہیں سنیں گے مگر جو وہ پسند کریں گے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيْهَا بُكْرَةً وَّ عَشِيًّا ۝ یعنی ان کے لیے صبح وشام ان کی خواہش کے مطابق کھانے اور مشروبات ہوں گے یعنی ان دونوں وقتوں کی مقدار میں کیونکہ وہاں جنت میں نہ صبح ہوگی نہ شام جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَّ رَوَاحُهَا شَهْرٌ (سبا:12) یعنی مہینہ کی مقدار۔ یہ مفہوم حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ابن جریج وغیرہ نے بیان کیا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے انہیں اہل جنت کے احوال کا اعتدال بتایا ہے۔ اور عربوں کے نزدیک خوشگوار کھانا اور مشروب صبح وشام کا ہے۔ یحییٰ بن ابی کثیر اور قتادہ نے کہا: عربوں میں سے جس کو صبح وشام کھانا میسر ہوتا وہ الناعم (نعمت والا) شمار ہوتا۔ پس یہ آیت نازل ہوئی۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد یہ ہے کہ جنت میں ان کا رزق منقطع نہ ہوگا جیسا کہ فرمایا: لَّا مَقْطُوْعَةٍ وَّ لَا مَمْنُوْعَةٍ ۝ (الواقعہ) جیسے تو کہتا ہے: أنا أصبح وأمسی فی ذکرك، یعنی میں ہمیشہ تیرا ذکر کرتا رہتا ہوں۔ یہ بھی احتمال ہے کہ بُكْرَةً سے مراد ان کے لذات سے مشغول ہونے سے پہلے کا وقت ہو اور العشی سے مراد ان کے لذات سے فارغ ہونے کے بعد کا وقت ہے، کیونکہ ان اوقات کو ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف منتقل ہونے کے لیے فترات (وقفہ) حائل ہوتے ہیں۔ یہ قول پہلے قول کی طرف راجع ہے۔ زبیر بن بکار نے اسماعیل بن ابی اُلیس سے روایت کیا ہے فرمایا: حضرت مالک بن انس نے فرمایا: مومنین کا کھانا دن میں دو مرتبہ ہوگا، اور پھر یہ تلاوت کی: وَ لَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيْهَا بُكْرَةً وَّ عَشِيًّا ۝ پھر فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مومنین کو روزوں میں صبح کے کھانے کے عوض سحر کا کھانا دیا تاکہ اپنے رب کی عبادت پر قوت حاصل کریں۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ اس لیے ذکر فرمایا کیونکہ غدا (صبح کا کھانا) کی صفت وہیئت، شام کے کھانے کی صفت اور ہیئت سے مختلف ہوتی ہے اور یہ صرف بادشاہ ہی جانتے ہیں، اسی طرح جنت میں صبح کا کھانا، شام کے کھانے سے مختلف ہوگا انہیں مختلف قسم کی نعمتیں دی جائیں گے تاکہ تنعم اور رشک میں اضافہ ہو۔ حکیم ترمذی نے ''نوادر الاصول'' میں ابان عن الحسن وابی قلابہ کی حدیث سے روایت کیا ہے فرمایا: ایک شخص نے عرض کی یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا جنت میں رات ہے؟ آپ نے فرمایا: تجھے اس کے متعلق سوال کرنے پر کس چیز نے ابھارا ہے؟ اس شخص نے کہا: میں نے سنا ہے اللہ تعالیٰ نے کتاب میں ذکر کیا ہے: وَ لَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيْهَا بُكْرَةً وَّ عَشِيًّا ۝ میں نے سوچا بکرۃ اور عشیا کے درمیان رات ہوگی، نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جنت میں کوئی رات نہیں''۔ جنت میں صرف نور اور روشنی ہے صبح شام پر لوٹے گی اور نمازوں کے اوقات میں جس میں وہ نمازیں پڑھتے تھے ان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے تحائف آئیں گے اور فرشتے انہیں سلام کریں گے یہ اس آیت کے مفہوم کا بیان ہے۔ ہم نے کتاب ''التذکرہ'' میں اس کا ذکر کیا ہے (1)۔ علماء نے فرمایا: جنت میں رات ہے، نہ دن ہے جنتی ہمیشہ نور میں ہوں گے وہ رات کی مقدار پردوں کے لٹکانے سے جانیں گے اور دروازوں کے بند ہونے سے پہچانیں گے اور دن کی مقدار پردوں کے اٹھنے اور دروازوں کے کھلنے سے پہچانیں گے؛ یہ ابو الفرج جوزی اور مہدوی وغیرہما نے ذکر کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْ یہ جنت جس میں رہنے والوں کے

1۔ کتاب التذکرہ، صفحہ 504-505

احوال ہم نے بیان کیے۔ نُوْرِثُ تخفیف کے ساتھ ہے۔ یعقوب نے نورّث واو کے فتحہ اور راء کی شد کے ساتھ پڑھا ہے۔ بہتر تخفیف ہی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ (فاطر: 32)

مِنْ عِبَادِنَا مَنْ كَانَ تَقِيًّا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس کا مطلب ہے جو مجھ سے ڈرا اور میری اطاعت کا عمل کیا۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ تقدیم و تاخیر ہے۔ تقدیر اس طرح ہے: نورث من کان تقیا من عبادنا۔ ہم اپنے بندوں میں متقین کو وارث بنائیں گے۔

وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ ۚ لَهٗ مَا بَيْنَ اَيْدِيْنَا وَمَا خَلْفَنَا وَمَا بَيْنَ ذٰلِكَ ۚ وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا ۞ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ ۭ هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا ۞

''اور (جبریل! میرے نبی سے کہو) ہم نہیں اترتے مگر آپ کے رب کے حکم سے اسی کا ہے جو ہمارے سامنے ہے اور جو ہمارے پیچھے ہے اور جو کچھ اس کے درمیان ہے اور نہیں ہے آپ کا رب بھولنے والا۔ وہ پروردگار ہے آسمانوں اور زمین کا اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سو اس کی عبادت کرو اور ثابت قدم رہو اس کی عبادت پر، کیا تم جانتے ہو کہ اس کا کوئی ہم مثل ہے''۔

ترمذی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے فرمایا: نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل سے کہا: ''کیا چیز تجھے اس سے مانع ہے کہ تو ہماری اس سے زیادہ ملاقات کرے جتنی کہ تو (پہلے) کرتا ہے'' (1)۔ تو یہ آیت نازل ہوئی: وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ۔ یہ حدیث حسن غریب ہے اس حدیث کو امام بخاری نے روایت کیا ہے ہمیں خلاد بن یحییٰ نے بتایا ہمیں عمرو بن ذر نے بتایا انہوں نے کہا میں نے اپنے باپ کو یہ بات کرتے ہوئے سنا انہوں نے سعید بن جبیر سے انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل سے کہا: ''تمہیں اس سے زیادہ ہماری ملاقات سے کیا مانع ہے (2)؟'' تو یہ آیت نازل ہوئی: وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ فرمایا: یہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو جواب تھا۔ مجاہد نے کہا: فرشتے (جبریل) نے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں آنے سے دیر لگادی پھر حاضر ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: تجھے کس چیز نے دیر کرادی ہے؟ جبریل نے کہا: ہم تمہارے پاس کیسے آئیں جبکہ تم اپنے ناخن نہیں کاٹتے اور اپنی مونچھیں نہیں کاٹتے اور اپنی انگلیوں کے جوڑوں کے درمیان کی جگہ کو صاف نہیں کرتے اور مسواک نہیں کرتے۔ مجاہد نے کہا: یہ آیت اس پر نازل ہوئی۔ مجاہد، قتادہ، عکرمہ، ضحاک، مقاتل اور کلبی کا قول ہے کہ جبریل نے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آنے میں دیر لگادی جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے لوگوں نے اصحاب کہف، ذی القرنین اور روح کے بارے میں سوال کیا تھا آپ نہیں جانتے تھے کہ انہیں کیا جواب دیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو امید تھی کہ جبریل ان کے سوال کا جواب لائیں گے۔ عکرمہ نے کہا: چالیس دن بعد آپ

1۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، سورۂ مریم، جلد 2، صفحہ 145۔ ایضاً حدیث نمبر 3083، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، تفسیر سورۂ مریم، ما نتنزل الا بامر ربک، جلد 2، صفحہ 691

کے پاس جبریل آئے۔ مجاہد نے کہا: بارہ راتوں کے بعد آئے۔ بعض نے کہا: پندرہ دنوں کے بعد آئے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''تو نے بہت تاخیر کردی حتی کہ میرا گمان صحیح نہ رہا اور مجھے تیرا بہت اشتیاق ہوا''۔ جبریل نے کہا: مجھے آپ (کی ملاقات) کا شوق تھا لیکن میں عبد مامور (حکم کا بندہ) ہوں جب مجھے بھیجا جاتا ہے تو حاضر ہوتا ہوں اور جب مجھے روکا جاتا ہے تو رک جاتا ہوں۔ تو یہ آیت نازل ہوئی: وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ۔ اور یہ نازل فرمایا: وَالضُّحٰى ۙ وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰى ۙ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى ۝ (والضحیٰ) یہ ثعلبی، واحدی اور قشیری وغیرہم نے ذکر کیا ہے (1)۔ بعض نے فرمایا: یہ اہل جنت کی طرف سے خبر دی ہے کہ وہ جنت میں داخلہ کے وقت یہ کہیں گے: ہم ان جنتیوں میں نہیں اترے مگر اپنے رب کے حکم سے۔ اس صورت میں آیت کا ماقبل سے تعلق ہوگا۔ اور جو پہلے ہم نے اقوال ذکر کیے ہیں ان کی بنا پر بعض علماء نے فرمایا: اس کا ماقبل سے تعلق نہیں ہے۔ قرآن سورتوں میں ہے پھر سورتیں جملوں پر مشتمل ہیں ہر جملہ دوسرے جملہ سے جدا ہوتا ہے۔ وَمَا نَتَنَزَّلُ یعنی اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے جبریل! تم کہو: وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ۔ یہ دو احتمال رکھتا ہے۔

ا۔ جب ہمیں حکم ہوتا ہے تو ہم آپ پر اترتے ہیں۔ ۲۔ جب تمہارا رب حکم دیتا ہے تو ہم آپ پر اترتے ہیں۔ پہلی صورت پر امر، نزول کی طرف متوجہ ہوگا اور دوسری صورت پر تنزیل کی طرف متوجہ ہوگا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَهٗ، یعنی اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ مَا بَيْنَ اَيْدِيْنَا یعنی جو کچھ ہمارے سامنے ہے اس کا اللہ کو علم ہے اور جو کچھ ہمارے پیچھے ہے اور جو ان کے درمیان ہے سب کا اس کو علم ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، ابن جریج نے فرمایا: اس کا معنی ہے جو کچھ دنیا کے معاملات سے ہمارے سامنے گزر چکا ہے جو بعد میں ہوگا اور آخرت کے امر سے ہے، اس کا اللہ تعالیٰ کو علم ہے۔ وَمَا بَيْنَ ذٰلِكَ سے مراد برزخ ہے۔ قتادہ اور مقاتل نے کہا: لَهٗ مَا بَيْنَ اَيْدِيْنَا، سے مراد امر آخرت ہے اور خَلْفَنَا سے مراد جو گزر چکا ہے۔ وَمَا بَيْنَ ذٰلِكَ سے مراد دو نفخوں کے درمیان جو ہمارے اور ان کے درمیان چالیس سال کا عرصہ ہوگا۔ اخفش نے کہا: مَا بَيْنَ اَيْدِيْنَا سے مراد ہے جو ہم سے پہلے تخلیق ہو چکا تھا۔ وَمَا خَلْفَنَا جو کچھ ہمارے مرنے کے بعد ہوگا۔ وَمَا بَيْنَ ذٰلِكَ جو کچھ ہماری تخلیق سے لے کر ہمارے مرنے تک ہوگا۔ بعض علماء نے فرمایا: مَا بَيْنَ اَيْدِيْنَا سے مراد ثواب، عقاب اور امور آخرت ہیں اور وَمَا خَلْفَنَا سے مراد دنیا میں جو ہمارے اعمال میں سے ہو چکے۔ وَمَا بَيْنَ ذٰلِكَ وہ اس وقت سے قیامت تک ہوگا۔ اور پانچواں احتمال یہ بھی ہے کہ مَا بَيْنَ اَيْدِيْنَا سے مراد آسمان ہے وَمَا خَلْفَنَا سے مراد زمین ہے۔ وَمَا بَيْنَ ذٰلِكَ سے مراد وہ ہے جو آسمان اور زمین کے درمیان ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ لَهٗ مَا بَيْنَ اَيْدِيْنَا سے مراد دنیا سے زمین تک ہے اور وَمَا خَلْفَنَا سے مراد آسمان ہیں۔ یہ پہلے قول کا برعکس ہے اور وَمَا بَيْنَ ذٰلِكَ سے مراد ہوا ہے۔ پہلا قول ماوردی نے ذکر کیا ہے اور دوسرا قشیری نے ذکر کیا ہے۔ زمخشری نے کہا: بعض علماء نے فرمایا جو ہماری عمروں سے گزر چکا ہے اور وہ حال جس میں ہم ہیں اور مابین ذینک نہیں فرمایا۔ کیونکہ مابین سے مراد وہی ہے جو ہم نے ذکر کیا ہے اس کے درمیان جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ ؕ عَوَانٌ

1۔ اسباب النزول للواحدی، صفحہ 310

بَيْنَ ذٰلِكَ (البقرہ:68) یعنی جو ہم نے ذکر کیا ہے اس کے درمیان۔ وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا۝ یعنی آسمانوں اور زمین کا رب ہے اور ان کا خالق ہے اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اس کا خالق ہے اور ان کا مالک ہے اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اس کا مالک ہے جس طرح زمانہ کی تدبیر اس کے سپرد ہے اسی طرح اعیان کی تدبیر بھی اس کے سپرد ہے۔ فَاعْبُدْهُ، اس لیے اسی کی عبادت کر۔ اس میں دلیل ہے کہ خلق کے اکتسابات (کوششیں) اللہ تعالیٰ کی وجہ سے ہیں جیسا کہ اہل حق کا قول ہے اور یہی تو حق ہے کیونکہ اس جگہ رب کو اس کے معانی پر محمول کرنا ممکن نہیں مگر مالک کے معنی پر۔ جب یہ ثابت ہو گیا کہ وہ آسمان اور زمین کا مالک ہے تو اس میں مخلوق کا اکتساب بھی داخل ہے اور اس کی عبادت واجب ہے۔ جب ثابت ہوا کہ وہ علی الاطلاق مالک ہے اور عبادت کی حقیقت حد درجہ عاجزی کے ساتھ طاعت ہے تو مالک و معبود کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے۔ وَ اصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ یعنی ثابت قدم رہو اس کی طاعت پر اور وحی کی تاخیر سے پریشان نہ ہوں بلکہ اس میں مشغول رہو جس کا تمہیں حکم دیا گیا ہے۔ اصطبر کی اصل اصتبر ہے، تا اور صاد کو ان کے اختلاف کی وجہ سے جمع کرنا ثقیل تھا تو تا کو طا سے بدل دیا گیا جیسے تو کہتا ہے: اصطام، یہ الصوم سے ہے۔

هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا۝ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس سے مراد یہ ہے کہ کیا تو اس کے لیے کوئی بیٹا یا اس کی کوئی مثال جانتا ہے یا کوئی شبیہ جانتا ہے جو اس کے نام الرحمٰن کی مثل نام کا مستحق ہو(1)۔ یہ مجاہد نے کہا ہے: یہ اسماء ة سے مشتق ہے۔ اسرائیل نے سماک سے انہوں نے عکرمہ سے انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے فرمایا: کیا تو کسی کو جانتا ہے جس کو الرحمٰن کہا جاتا ہو؟ نحاس نے کہا: یہ عظیم سند سے جو میں جانتا ہوں جو اس حرف میں مروی ہے یہ صحیح قول ہے۔ الرحمٰن صرف اللہ تعالیٰ کو ہی کہا جاتا ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ بسم اللہ کی بحث میں وضاحت ہو چکا ہے۔ الحمد للہ۔ ابن ابی نجیح نے مجاہد سے هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا کے تحت سمیا کا معنی مثلا روایت کیا ہے۔ ابن مسیب نے اس کا معنی عدلا روایت کیا ہے۔ قتادہ اور کلبی نے کہا: اس کا مطلب ہے کیا تو کوئی ایسا جانتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ کے علاوہ اللہ تعالیٰ کہا جاتا ہو سوائے اللہ تعالیٰ کے؟ هل بمعنی لا ہے یعنی تو نہیں جانتا۔ واللہ اعلم۔

وَيَقُوْلُ الْاِنْسَانُ ءَاِذَا مَا مِتُّ لَسَوْفَ اُخْرَجُ حَيًّا۝ اَوَلَا يَذْكُرُ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ يَكُ شَيْـًٔا۝ فَوَرَبِّكَ لَنَحْشُرَنَّهُمْ وَالشَّيٰطِيْنَ ثُمَّ لَنُحْضِرَنَّهُمْ حَوْلَ جَهَنَّمَ جِثِيًّا۝ ثُمَّ لَنَنْزِعَنَّ مِنْ كُلِّ شِيْعَةٍ اَيُّهُمْ اَشَدُّ عَلَى الرَّحْمٰنِ عِتِيًّا۝ ثُمَّ لَنَحْنُ اَعْلَمُ بِالَّذِيْنَ هُمْ اَوْلٰى بِهَا صِلِيًّا۝ وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا ۚ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا۝ ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا۝

1۔ تفسیر طبری، جز 15، صفحہ 123

''اور انسان (ازراہ انکار) کہتا ہے کہ کیا جب میں مرجاؤں گا تو مجھے پھر زندہ کر کے نکالا جائے گا۔ کیا یاد نہ رہا انسان کو کہ ہم نے ہی پیدا کیا اسے اس سے پہلے حالانکہ وہ کچھ بھی نہ تھا۔ سو (اے محبوب!) تیرے رب کی قسم ہم جمع کریں گے انہیں بھی اور شیطانوں کو بھی پھر حاضر کریں گے ان سب کو جہنم کے اردگرد کہ وہ گھٹنوں کے بل گرے ہوں گے۔ پھر ہم (چن چن کر) الگ کریں گے ہر گروہ سے ان لوگوں کو جو (خداوند) رحمٰن کے سخت نافرمان تھے۔ پھر ہم ہی خوب جانتے ہیں ان لوگوں کو جو زیادہ مستحق ہیں اس آگ میں تپائے جانے کے۔ اور تم سے کوئی ایسا نہیں مگر اس کا گزر دوزخ پر ہوگا یہ آپ کے رب پر لازم ہے (اور اس کا) فیصلہ ہو چکا ہے۔ پھر ہم نجات دیں گے پرہیزگاروں کو اور رہنے دیں گے ظالموں کو دوزخ میں کہ وہ گھٹنوں کے بل گرے ہوں گے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ يَقُوْلُ الْاِنْسَانُ ءَاِذَا مَامِتُّ لَسَوْفَ اُخْرَجُ حَيًّا ۝ انسان سے مراد یہاں ابی بن خلف ہے اس نے پرانی ہڈیاں پائیں پھر انہیں اپنے ہاتھ سے مسل دیا اور کہا: محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا خیال ہے کہ ہم مرنے کے بعد اٹھائے جائیں گے؛ یہ کلبی کا قول ہے، یہ واحدی، ثعلبی نے ذکر کیا ہے۔ اور مہدوی نے کہا: یہ ولید بن مغیرہ اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں نازل ہوئی؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ لَسَوْفَ میں لام تاکید کے لیے ہے گویا اسے کہا گیا: جب تو مرے گا تو یقیناً زندہ کر کے اٹھایا جائے گا تو اس نے کہا: کیا جب میں مرجاؤں گا تو مجھے پھر زندہ کر کے نکالا جائے گا؟ یہ اس نے انکار کرتے ہوئے کہا۔ پس لام اس کے جواب میں آیا جیسا کہ پہلے قول میں تھا اگر یہ ابتدائی کلام ہوتی تو اس پر لام داخل نہ ہوتا کیونکہ یہ تاکید اور ایجاب کے لیے ہوتا ہے وہ دوبارہ اٹھنے کا منکر تھا۔ ابن ذکوان نے: اذا مامت پڑھا ہے اور دوسرے قراء نے استفہام کے ساتھ پڑھا ہے جیسا کہ اس کا ہمزہ میں اصول ہے۔ حسن اور ابوحیوہ نے لَسَوْفَ اُخْرَجُ حَيًّا پڑھا ہے۔ یہ اس نے استہزا کیا تھا کیونکہ وہ دوبارہ اٹھنے پر یقین نہیں کرتا تھا اور یہاں انسان سے مراد کافر ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَوَ لَا يَذْكُرُ الْاِنْسَانُ یعنی کیا یہ کہنے والے کو یاد نہیں؟ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ یعنی اس کے سوال اور اس کے اس قول سے پہلے ہم نے اسے پیدا کیا۔ وَ لَمْ يَكُ شَيْـًٔا ۝ جبکہ وہ کچھ بھی نہ تھا، اعادہ ابتدا کی طرح ہوتا ہے پس تناقض نہیں۔ عاصم کے سوا اہل کوفہ، اہل مکہ، ابوعمرو اور ابوجعفر نے اولایذکر پڑھا ہے۔ شیبہ، نافع اور عاصم نے اَوَلَا يَذْكُرُ تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ بہتر تشدید ہے اس کی اصل یتذکر ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝ (الزمر) اور اس قسم کے دوسرے ارشادات ہیں۔ اور ابی کی قرأت میں اولایتذکر ہے؛ یہ قرأت تفسیر کی بنا پر ہے کیونکہ مصحف کے خط کے مخالف ہے۔ یتذکر کا معنی یتفکر ہے اور یذکر کا معنی یتنبہ اور یعلم ہے؛ یہ نحاس کا قول ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَوَرَبِّكَ لَنَحْشُرَنَّهُمْ حجت قائم کرنے کے بعد اپنی قسم اٹھائی کہ وہ ضرور قبور سے نکل کر محشر کی طرف جمع ہوں گے جس طرح کہ مومنین کو جمع کیا جائے گا۔ وَالشَّيٰطِيْنَ یعنی شیاطین جو ان کے ساتھ ہیں ان کو بھی ہم جمع کریں گے۔ بعض علماء نے فرمایا: ہر کافر شیطان کے ساتھ ایک زنجیر میں جکڑ کر لایا جائے گا جس طرح فرمایا: اُحْشُرُوا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَ اَزْوَاجَهُمْ (الصافات: 22) زمخشری نے کہا: والشیاطین میں واو عطف کے لیے بھی ہو سکتی ہے اور بمعنی مع بھی ہو

سکتی ہے یہ بمعنی مع زیادہ مناسب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انہیں ان کے ان شیاطین ساتھیوں کے ساتھ جمع کیا جائے گا جنہوں نے انہیں اغوا اور گمراہ کیا ہر کافر شیطان کے ساتھ ایک زنجیر میں جکڑا ہوگا۔ اگر تو کہے: یہ مفہوم اس صورت میں ہے جب انسان سے مراد خاص کافر ہی ہوں اگر انسان سے مراد عام انسان ہوں تو پھر انہیں شیاطین کے ساتھ کیسے جمع کیا جائے گا؟ میں کہوں گا: جب سب لوگوں کو جمع کیا جائے گا تو ان میں سے کافر شیاطین کے ساتھ جکڑے ہوں گے وہ شیاطین کے ساتھ جمع کیے جائیں گے جس طرح ان کو کفار کے ساتھ جمع کیا جائے گا۔ اگر تم کہو کہ حشر میں بدبختوں سے سعادت مندوں کو الگ کیوں نہیں کیا گیا ہوگا جس طرح جزا میں وہ ان سے الگ کیے جائیں گے؟ میں کہوں گا: محشر میں ان کے درمیان جدائی نہ ہوگی وہ حاضر کیے جائیں گے جہاں وہ جہنم کے اردگرد گھٹنوں کے بل گرے پڑے ہوں گے اور ان کے ساتھ انہیں آگ میں وارد کیا جائے گا تا کہ وہ سعادت مندوں کے احوال دیکھ لیں اللہ تعالیٰ نے جنہیں نجات دی اور انہیں خلاصی بخشی تا کہ کفار کو شک زیادہ ہو اور اولیاء اللہ کی سعادت اور ان پر سعادت مندوں کی خوشی سے انہیں تکلیف زیادہ ہو۔ اگر تو کہے کہ گھٹنوں کے بل انہیں لانے کا کیا مطلب ہے؟ تو میں کہوں گا: جب انسان سے مراد خاص انسان (کافر) ہوں تو معنی یہ ہوگا کہ انہیں محشر سے جہنم کے کنارے کی طرف مجبور کر کے لے جایا جائے گا ان کی وہی حالت ہوگی جو ان کی موقف میں ہوگی وہ گھٹنوں کے بل چلیں گے قدموں پر نہیں چلیں گے یہ اس طرح ہے کہ اہل موقف کی جثو (گھٹنے کے بل چلنا) کی صفت بیان کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَتَرٰى كُلَّ اُمَّةٍ جَاثِيَةً (الجاثیہ: 28) ہر شخص مواقف میں گفتگو اور نقل ہونے کی مخصوص حالت میں ہوگا کچھ لوگ گھٹنوں کے بل کھڑے ہوں گے کیونکہ اس میں غیر اطمینانی اور پریشانی ہے۔ الجثا کا اطلاق طمانینت کے خلاف پر ہوگا یا انہیں ایسی شدت اور سختی لاحق ہوگی کہ وہ اپنے قدموں پر کھڑے بھی نہ ہو سکیں گے اور گھٹنوں کے بل چلیں گے۔ اور اگر انسان سے مراد عام انسان ہو تو معنی یہ ہوگا کہ وہ جہنم کے کنارے پر پہنچنے کے وقت گھٹنوں کے بل گر جائیں گے، اس پر بنا پر جثیا، حال مقدرہ ہوگا جیسا کہ وہ موقف میں گھٹنوں کے بل تھے کیونکہ یہ حساب کے لیے کھڑے ہونے کے توابع سے ثواب اور عقاب تک پہنچنے سے پہلے ہے۔ کہا جاتا ہے کہ: لَنُحْضِرَنَّهُمْ حَوْلَ جَهَنَّمَ جِثِيًّا یعنی وہ اپنے گھٹنوں پر ہوں گے کہ وہ قیام پر قادر نہ ہوں گے۔ حَوْلَ جَهَنَّمَ اس میں یہ بھی جائز ہے کہ اس سے مراد جہنم کا داخل ہو جیسے تو کہتا ہے: جلس القوم حول البیت، قوم گھر کے اندر بیٹھی اس کے اردگرد طواف کرتے ہوئے۔ اور حَوْلَ جَهَنَّمَ یہ بھی جائز ہے کہ یہ دخول کے بعد ہو اور یہ بھی جائز ہے کہ دخول سے پہلے ہو۔ جِثِيًّا جمع ہے جاثٍ کی، کہا جاتا ہے: جثا علی رکبتیہ، یجثو ویجثی جثوا وجُثیا، مصدر دونوں میں فعول کے وزن پر ہے۔ اجثاہ غیرہ، قوم جثی، جیسے جلس، جلوسا اور قوم جلوس ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جثیا کا مطلب جماعات ہے۔ مقاتل نے کہا: اس کا معنی ہے جمعاً جمعاً (اکٹھا اکٹھا) اس تاویل پر یہ جُثوۃ جَثوۃ اور جِثوۃ تینوں لغات ہیں۔ یہ جمع شدہ پتھروں اور جمع شدہ مٹی کو کہتے ہیں، شرابی لوگ علیحدہ ہوں گی، زانی علیحدہ ہوں گے اسی طرح سارے مجرم علیحدہ ہوں گے۔ طرفہ نے کہا:

تَرَى جُثْوَتَيْنِ من تُرَابٍ عليهما صفائحُ صُمٌّ من صفيحٍ مُنَضَّدِ

حسن اور ضحاک نے کہا: گھٹنوں کے بل کھڑا ہونا۔ اس تاویل پر یہ جاثٍ کی جمع ہوگی جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اور یہ جگہ کی تنگی کی وجہ سے ہوگا یعنی ان کے لیے مکمل بیٹھنا ممکن نہ ہوگا۔ بعض نے فرمایا: آپس میں جھگڑنے کی وجہ سے گھٹنوں کے بل ہوں گے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عِنْدَ رَبِّكُمْ تَخْتَصِمُوْنَ۝ (الزمر)

کمیت نے کہا ہے:

ثم تركوا مَعاتهم جثيًا وهم دون السَّراةِ مقرّبينا

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ لَنَنْزِعَنَّ مِنْ كُلِّ شِيْعَةٍ یعنی ہم ہر امت اور ہر اہل دین سے نکالیں گے۔ اَيُّهُمْ اَشَدُّ عَلَى الرَّحْمٰنِ عِتِيًّا۝ نحاس نے کہا: یہ آیت ترکیب کے اعتبار سے بہت مشکل ہے کیونکہ تمام قراء ایھم کو رفع کے ساتھ پڑھتے ہیں سوائے ہارون قاری اعور کے۔ سیبویہ نے اس سے اَيُّهُمْ پر نصب دی ہے کیونکہ اس پر لَنَنْزِعَنَّ کو واقع کیا ہے۔ ابو اسحٰق نے کہا: اَيُّهُمْ کے رفع میں تین اقوال ہیں۔ خلیل بن احمد نے کہا: یہ سیبویہ نے اس سے حکایت کیا ہے کہ یہ حکایت پر مرفوع ہے اس کا مفہوم یہ ہے: ثم لننزعن من كل شيعة الذي يقال من أجل عتوه أيهم أشد على الرحمٰن عتيا۔ اور خلیل نے بطور دلیل یہ شعر پیش کیا ہے:

ولقد أبيت من الفتاة بمنزلٍ فأبيتُ لا حرجٌ ولامحروم

یعنی فابیت بمنزلة الذي يقال له لا هو حرج ولا محروم۔ ابو جعفر نحاس نے کہا: میں نے ابو اسحاق کو دیکھا وہ اس قول کو پسند کرتے تھے اور اچھا سمجھتے تھے فرمایا: کیونکہ یہ اہل تفسیر کے قول کا معنی ہے اور یہ کہا ہے کہ ثُمَّ لَنَنْزِعَنَّ مِنْ كُلِّ شِيْعَةٍ کا معنی یہ ہے ثم لننزعن من كل فرقة الأعتى فالأعتى۔ یعنی ہم ہر فرقہ سے جو زیادہ نافرمان ہوگا اسے نکالیں گے پھر جو اس کے بعد نافرمان ہوگا اسے نکالیں گے جو سب سے زیادہ نافرمان ہوگا اسے عذاب دیا جائے گا پھر جو اس سے متصل ہوگا۔ یہ اس آیت کے معنی میں ابو اسحاق کے کلام کی نص ہے۔ یونس نے کہا: لَنَنْزِعَنَّ ان افعال کے قائم مقام ہے جو ملغی ہوتے ہیں اور اَيُّهُمْ کا رفع مبتدا کی حیثیت سے ہے۔ مہدی نے کہا: وہ فعل جو لننزعن ہے یونس کے نزدیک معلق ہے ابو علی نے کہا: اس کا معنی یہ ہے کہ ایھم اشد کی جگہ میں عمل کر رہا ہے ملغی نہیں ہے۔ اور خلیل اور سیبویہ کے نزدیک لننزعن کی مثل فعل معلق نہیں ہوتا افعال شک اور وہ افعال جن کا وقوع متحقق نہیں ہوتا وہ معلق ہوتے ہیں۔ سیبویہ نے کہا: ایھم مبنی برضمہ ہے کیونکہ حذف میں اس نے اپنے اخوات کی مخالفت کی ہے کیونکہ اگر تو کہے: رأيت الذي أفضل ومن أفضل تو یہ قبیح ہوگا حتیٰ کہ تو کہے: من هو أفضل، أيهم میں حذف جائز ہے۔ ابو جعفر نے کہا: میں کسی نحوی کو نہیں جانتا مگر اس نے اس میں سیبویہ کو غلط کہا ہے میں نے ابو اسحاق کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ سیبویہ کی کتاب میں میرے لیے کوئی غلطی ظاہر نہیں ہوئی مگر دو جگہوں پر ان میں سے ایک یہ ہے فرمایا: ہم جانتے ہیں کہ سیبویہ نے ایا کو اعراب دیا ہے جبکہ یہ مفرد ہے کیونکہ یہ مضاف ہوتا ہے وہ اسے کیسے مبنی بناتا ہے جبکہ یہ مضاف ہوتا ہے؟ ابو اسحاق نے ذکر نہیں کیا مگر یہی تین اقوال۔ ابو علی نے کہا: سیبویہ کے مذہب پر مبنی ہونا واجب ہے کیونکہ جس وجہ سے یہ پہچانا جاتا ہے وہ اس سے حذف کیا گیا ہے اور وہ ضمیر ہے حالانکہ اس کی احتیاج ہے جیسا

کہ: من قبل و من بعد میں وہ چیز حذف کی گئی ہے جسکے ساتھ پہچانے جاتے ہیں کیونکہ صلہ موصول کی وضاحت کرتا ہے اور اسے خاص کرتا ہے۔ ابوجعفر نے کہا: اس میں ان مذکورہ تین اقوال کے علاوہ چار اقوال ہیں۔ کسائی نے کہا: لننزعن کا معنی ایھم پر واقع نہیں کہ اسے نصب دیتا ہے۔ مہدوی نے یہ زائد کہا ہے کہ اس کے نزدیک فعل، من کل شیعۃ کے محل پر واقع ہے۔ ایھم اشد جملہ مستانفہ ہے اور مبتدا کی حیثیت سے ایھم مرفوع ہے اور سیبویہ الواجب میں من کی زیادتی کے قائل نہیں۔ فراء نے کہا: اس کا معنی ہے ہم ندا کے ذریعے نکالیں گے اور لننزعن کا معنی پر واقع ہے جیسے تو کہتا ہے: لبست من الثیاب واکلت من الطعام اور لننزعن ہے ہم پکاریں گے۔ مہدوی نے کہا: نادیٰ فعل معلق ہوتا ہے جب اس کے بعد جملہ ہوتا ہے جیسا کہ ظننت ہے۔ پس یہ معنی میں عمل کرتا ہے اور لفظ میں عمل نہیں کرتا ہے۔ ابوجعفر نے کہا: ابوبکر بن شقیر نے حکایت کیا ہے کہ بعض کوفیوں نے کہا: ایھم میں شرط و جزا کا معنی ہے اس لیے ماقبل اس میں عمل نہیں کرتا، معنی یہ ہے پھر ہم ہر ایک فرقہ سے نکالیں گے اگر تم گروہ ہو یا نہ ہو جیسے تو کہتا ہے: ضربت القوم أیھم غضب، معنی یہ ہے کہ اگر وہ غصہ میں ہوں یا نہ ہوں میں قوم کو ماروں گا۔ ابوجعفر نے کہا: یہ چھ اقوال ہیں۔ میں نے علی بن سلیمان کو محمد بن یزید سے یہ حکایت کرتے ہوئے سنا کہ ایھم، شیعۃ کے متعلق ہے وہ مبتدا کی حیثیت سے مرفوع ہے معنی یہ ہے پھر ہم ان لوگوں سے نکالیں گے جنہوں نے آپس میں تعاون کیا اور دیکھا کہ کون رحمٰن کا سخت نافرمان ہے؟ یہ حسن کا قول ہے۔ کسائی نے حکایت کیا ہے کہ التشایع کا معنی تعاون کرنا ہے۔ اور عتیا کو نصب بیان کی وجہ سے ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ لَنَحْنُ اَعْلَمُ بِالَّذِيْنَ هُمْ اَوْلٰى بِهَا صِلِيًّا۝ یعنی وہ آگ میں داخل ہونے کے زیادہ حقدار ہیں۔ کہا جاتا ہے: صَلِیَ یَصْلیٰ صُلِیا، جیسے مضی یمضی مُضِیا جب کوئی چلا جائے۔ ھویٰ یھویٰ ھُوِیا۔ جوہری نے کہا: کہا جاتا ہے صلیت الرجل نارا جب تو کسی کو آگ میں جھونک دے، گویا تو اسے جلانا چاہتا ہے۔ میں کہتا ہوں: اصلیتہ الف کے ساتھ و صلیتہ تصلیۃ بھی آتا ہے۔ ویُصَلّیٰ سَعِیرًا بھی پڑھا گیا ہے۔ اور جنہوں نے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے تو وہ عربوں کے اس قول سے ہوگا: صَلِیَ فلان بالنار لام کے کسرہ کے ساتھ۔ یصلی صُلِیا اس کا معنی ہے جل جانا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: هُمْ اَوْلٰى بِهَا صِلِيًّا۔ عجاج نے کہا:

والله لولا النارُ أن نصلاها

اسی طرح کہا جاتا ہے: صلی بالامر جب گرمی اور شدت سخت ہو جائے۔ طہوی نے کہا:

وَلَا تَبْلَى بَسَالَتُهُمْ وَاِنْ هُمْ صَلُوا بالحرب حِينًا بعد حِينِ

واصطلیت بالنار و تصلیت بھا

ابوزبید نے کہا:

وقد تَصَلَّيْتُ حَرَّحَرْبِهِمْ كما تَصَلَّى الْمَقْرُوْرُ من قَرَسِ

فلانٌ لایُصْطَلیٰ بنارہ کہا جاتا ہے جب کوئی بہادر شخص ہو اور اس کا مقابلہ نہ کیا جاتا ہو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا ۚ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا ۝ اس میں پانچ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِنْ مِّنْكُمْ یہ قسم ہے اور واؤ قسم کو متضمن ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث اس کی تفسیر بیان کرتی ہے۔ لایموت لأحدٍ من المسلمین ثلاثة من الولد فتمسه النار الا تحلة القسم۔ جس مسلمان کے تین بچے فوت ہو جاتے ہیں اسے آگ نہیں چھوئے گی مگر قسم پوری ہونے کی مقدار۔ زہری نے کہا: گویا یہ آیت مراد لے رہے ہیں وَ اِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا۔ یہ ابوداؤد طیالسی نے ذکر کیا ہے اور حدیث میں الا تحلة القسم کا قول تفسیر مسند میں نکلتا ہے، کیونکہ اس حدیث میں جو قسم مذکور ہے اہل علم کے نزدیک اس کا معنی یہ ارشاد ہے: وَ اِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا، بعض علماء نے فرمایا: القسم سے مراد یہ ارشاد ہے: وَالذّٰرِيٰتِ ذَرْوًا ۝ فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا ۝ فَالْجٰرِيٰتِ يُسْرًا ۝ فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا ۝ اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ ۝ وَّ اِنَّ الدِّيْنَ لَوَاقِعٌ ۝ (الذاریات) پہلا قول زیادہ مشہور ہے اور مفہوم قریب ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ الورود کے متعلق علماء کا اختلاف ہے، بعض نے فرمایا: اس سے مراد دخول ہے(1)۔ حضرت جابر بن عبداللہ سے مروی ہے فرمایا میں نے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: "الورود سے مراد دخول ہے کوئی نیکوکار اور فاجر باقی نہیں ہوگا مگر وہ دوزخ میں داخل ہوگا مومنین پر آگ ٹھنڈی اور سلامتی والی ہو جائے گی جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام پر ہوئی تھی"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّ نَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا ۝ ابو عمر نے کتاب "التمہید" میں اپنی سند کے ساتھ یہ ذکر کیا ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، خالد بن معدان، ابن جریج وغیرہم کا یہی قول ہے۔ یونس نے حسین سے روایت کیا ہے کہ وہ وَ اِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا پڑھتے تو الورود کی تفسیر الدخول سے بیان کرتے۔ بعض راویوں سے اس میں غلطی ہوئی اور انہوں نے الورود، الدخول کے الفاظ کو قرآن کے ساتھ لاحق کر دیا ہے۔ مسند دارمی میں حضرت عبداللہ بن مسعود سے مروی ہے فرمایا نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "لوگ آگ پر وارد ہوں گے پھر وہ اس سے اپنے اعمال کے ساتھ نکلیں گے پہلے لوگ بجلی کی چمک کی طرح تیزی سے نکلیں گے پھر (بعد والے) ہوا کی طرح نکلیں گے پھر (بعد والے) گھوڑے کی تیز رفتاری سے نکلیں گے پھر (بعد والے) اس مسافر کی تیزی سے نکلیں گے جو اپنی سواری کو تیز چلانے والا ہوتا ہے پھر اس شخص کی طرح جو تیز چلتا ہے"(2)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انہوں نے اس مسئلہ میں نافع بن ازرق خارجی سے فرمایا: رہا میں اور تو، تو ضرور ہم وارد ہوں گے۔ رہا میں تو اللہ تعالیٰ مجھے اس سے نجات دے گا اور رہا تو تو میں گمان نہیں کرتا کہ وہ تجھے نکالے گا تیرے جھٹلانے کی وجہ سے۔ اکثر علماء ڈرتے ہیں کیونکہ دوزخ پر ورود تو یقینی ہے لیکن اس سے نکلنا مجہول ہے۔ ہم نے یہ مسئلہ (التذکرہ) میں بیان کر دیا ہے۔ ایک جماعت نے کہا: الورود سے مراد پل صراط سے گزرنا ہے: یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت ابن مسعود اور کعب احبار اور سدی سے مروی ہے۔ سدی نے اس کو حضرت

1۔ صحیح بخاری، کتاب الجنائز، فضل من مات له ولد فاحتسب، جلد 2، صفحہ 145

2۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، سورۂ مریم، جلد 2، صفحہ 145۔ ایضاً، حدیث نمبر 3084، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ابن مسعود سے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے۔ حسن کا بھی یہی قول ہے فرمایا: الورود سے مراد الدخول نہیں ہے تو کہتا ہے: وردت البصرة ولم أدخل۔ میں بصرہ پر وارد ہوا اور داخل نہیں ہوا۔ فرمایا: الورود سے مراد پل صراط سے گزرنا ہے۔ ابوبکر انباری نے کہا: حسن کے مذہب پر اہل لغت کی ایک قوم نے بنیاد رکھی ہے اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے حجت پکڑی ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰۤى ۙ اُولٰٓىِٕكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ ۝ (الانبیاء)

یہ علماء فرماتے ہیں: وہ شخص دوزخ میں داخل نہ ہوگا جس کو اللہ تعالیٰ دوزخ سے دور کرنے کی ضمانت دے گا۔ اور وہ ثم کو ثاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ اور پہلے مقالہ والوں نے ان کے خلاف یہ حجت پکڑی ہے کہ اُولٰٓىِٕكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ ۝ کا معنی ہے دوزخ میں عذاب سے دور کرنا اور جلانے سے دور کرنا، جو اس میں داخل ہوگا وہ اسے محسوس نہیں کرے گا اور کوئی تکلیف نہیں پائے گا وہ حقیقت میں دوزخ سے دور کیا گیا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: ثُمَّ نُنَجِّی الَّذِیْنَ اتَّقَوْا سے استدلال کرتے ہیں۔ وہ ثم کو ثاء کے ضمہ کے ساتھ پڑھتے ہیں اور کہتے ہیں: ثم دخول کے بعد نجات پر دلالت کرتا ہے۔

میں کہتا ہوں: صحیح مسلم میں ہے "جہنم پر ایک پل لگایا جائے گا اور شفاعت کا در کھلے گا لوگ کہیں گے: سلم سلم سلامتی عطا فرما، سلامتی عطا فرما"(1)۔ عرض کی گئی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم وہ پل کیا ہے؟ فرمایا: "وہ ایک پھسلن ہے اس میں اچک لینے والے اور نوک دار مڑے ہوئے کنڈے ہیں۔ ان میں سہ شاخے کانٹے ہیں اس کو سعدان کہا جاتا ہے۔ مومنین آنکھ جھپکنے کی طرح گزریں گے اور بجلی کی طرح اور ہوا کی طرح اور پرندوں کی طرح اور عمدہ گھوڑوں کی طرح اور اونٹوں کی طرح کچھ نجات پانے والے سلامتی پانے والے ہوں گے۔ اور کچھ کو خراشیں آئیں گی اور چھوڑ دیے جائیں گے اور کچھ جہنم میں دھکیل دیے جائیں گے"۔

اس سے ان علماء نے حجت پکڑی ہے جو فرماتے ہیں کہ پل صراط سے گزر وہ ورود ہے جس کو یہ آیت اپنے ضمن میں لیے ہوئے ہے نہ کہ دوزخ میں داخل ہونا ہے۔ ایک جماعت نے کہا: بلکہ ورود سے مراد جھانکنا، اطلاع اور قرب ہے۔ وہ حساب کی طرح حاضر ہوں گے اور وہ جہنم کے قریب ہوگی پس وہ اس کی طرف حساب کی حالت میں دیکھیں گے پھر اللہ تعالیٰ انہیں اس سے نجات دے گا جو انہوں نے دیکھا پھر انہیں جنت کی طرف پھیر دیا جائے گا۔ وَّنَذَرُ الظّٰلِمِیْنَ ظالموں کو آگ کی طرف لے جانے کا حکم دیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدْیَنَ (القصص: 23) یعنی پانی پر جھانکا، اس کا یہ مطلب نہیں کہ پانی میں داخل ہوا۔ زہیر نے کہا:

فَلَمَّا وَرَدْنَ الماء زُرْقًا جِمَامُهُ وَضَعْنَ عِصِیَّ الحَاضِرِ المُتَخَیِّمِ

حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے روایت کیا ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "آگ میں اہل بدر اور اہل حدیبیہ میں سے کوئی داخل نہ ہوگا"(2)۔ فرماتی ہیں: میں نے عرض کی یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا کا قول کہاں جائے گا؟ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "خاموش، ثُمَّ نُنَجِّی الَّذِیْنَ اتَّقَوْا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِیْنَ فِیْهَا جِثِیًّا ۝" اس حدیث کو امام

1۔ تفسیر طبری، جز 16، صفحہ 131
2۔ ایضاً، جز 16-15، صفحہ 130

مسلم نے حضرت ام مبشر سے روایت کیا ہے فرماتی ہیں: میں نے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت حفصہ سے یہ فرماتے سنا (الحدیث) زجاج نے اس قول کو اس ارشاد کی وجہ سے ترجیح دی ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰۤى (الانبیاء:101) مجاہد نے کہا: مومنین کے آگ پر وارد ہونے سے مراد بخار ہے جو مومن کو دنیا میں لاحق ہوتا ہے یہی آگ سے مومن کا حصہ ہے وہ دوزخ کی آگ میں داخل نہ ہوگا۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مریض کی عیادت کی جس کو بخار تھا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فرمایا: "تمہیں بشارت ہو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہ (بخار) میری آگ ہے جو میں اپنے بندہ مومن پر مسلط کرتا ہوں تاکہ یہ آگ سے اس کا حصہ ہو جائے"۔ ابو عمر نے اسے مسند ذکر کیا ہے فرمایا عبدالوارث بن سفیان نے ہمیں بیان کیا فرمایا ہمیں قاسم بن اصبغ نے بیان کیا فرمایا ہمیں محمد بن اسماعیل صائغ نے بیان کیا فرمایا ہمیں ابواسامہ نے بیان کیا فرمایا ہمیں عبدالرحمٰن بن یزید بن جابر نے بیان کیا انہوں نے اسماعیل بن عبیداللہ سے انہوں نے ابو صالح اشعری سے انہوں نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مریض کی عیادت کی پھر یہ حدیث مذکورہ ذکر کی اور حدیث میں ہے "بخار، مومن کا آگ سے حصہ ہے" (1)۔ اور ایک جماعت نے کہا: الورود سے مراد قبر میں دوزخ کو دیکھنا ہے پھر کامیاب شخص کو اللہ تعالیٰ نجات دیتا ہے اور جس کی تقدیر میں اس میں داخل ہونا لکھا ہوگا وہ اس میں داخل ہوگا پھر اس سے شفاعت کے ذریعے یا اس کے علاوہ اللہ کی رحمت سے نکلے گا اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث سے ان علماء نے حجت پکڑی ہے کہ "جب تم میں سے کوئی فوت ہو جاتا ہے تو اس پر صبح و شام اس کا ٹھکانا پیش کیا جاتا ہے" (الحدیث) وکیع نے شعبہ سے انہوں نے عبداللہ بن سائب سے انہوں نے ایک شخص سے اس نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے انہوں نے وَ اِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا کی تفسیر میں فرمایا: یہ خطاب کفار کو ہے۔ ان سے یہ بھی روایت ہے کہ وہ وان منہم پڑھتے تھے وہ ان آیات پر اس کو لوٹاتے تھے جن میں کفار کا ذکر ہے اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَوَرَبِّكَ لَنَحْشُرَنَّهُمْ وَ الشَّيٰطِيْنَ ثُمَّ لَنُحْضِرَنَّهُمْ حَوْلَ جَهَنَّمَ جِثِيًّا ۝ اسی طرح عکرمہ اور ایک جماعت نے پڑھا ہے، اس قرأت پر کوئی جھگڑا نہیں۔ ایک فرقہ نے کہا: منکم سے مراد کافر ہیں معنی یہ ہے کہ اے پیارے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان سے کہو: یہ تاویل آسان ہے اور کاف ضمیر منکم میں لَنَحْشُرَنَّهُمْ وَ الشَّيٰطِيْنَ میں ھا کی طرف لوٹ رہی ہے۔ پس کاف کا ھاء کی طرف لوٹانا پسندیدہ نہیں یہ اس ارشاد میں بھی معروف ہے۔ وَ سَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا ۝ اِنَّ هٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَآءً وَّ كَانَ سَعْيُكُمْ مَّشْكُوْرًا ۝ (الدہر) اس آیت میں كَانَ لَكُمْ سے مراد کان لہم ہے۔ کاف ضمیر ھاء کی طرف راجع ہے۔ اکثر علماء نے فرمایا: مخاطب تمام عالم ہے اور تمام کا ورود ضروری ہے اس پر ورود میں اختلاف پیدا ہوا ہے۔ ہم نے اس کے متعلق علماء کے اقوال بیان کر دیے ہیں۔ ورود کا ظاہر معنی دخول ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: فتنة النار۔ المسیس کا معنی لغت میں چھونا ہے۔ مگر وہ آگ مومنین پر ٹھنڈی اور سلامتی والی ہو جائے گی اور وہ اس سے سلامتی کے ساتھ نجات پائیں گے۔

1۔ جامع ترمذی، کتاب الطب، ما جاء تبرید الحمیٰ، جلد 2، صفحہ 29-28۔ ایضاً، حدیث نمبر 2014، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
ایضاً، ابن ماجہ، باب الحمی، حدیث نمبر 3460، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

خالد بن معدان نے کہا: جب اہل جنت، جنت میں داخل ہوں گے تو وہ دیکھیں گے کیا ہمارے رب نے کہا نہیں تھا کہ ہم آگ پر وارد ہوں گے؟ انہیں کہا جائے گا: تم اس میں وارد ہوئے تھے پس تم نے اسے راکھ پایا۔

میں کہتا ہوں: یہ قول مختلف اقوال کا جامع ہے اگر کوئی اس میں وارد ہوا اور اسے آگ اپنے شعلے سے اذیت نہ دے تو وہ اس سے دور کیا گیا اور اس سے بچایا گیا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے فضل وکرم سے نجات عطا فرمائے، ان لوگوں سے کرے جو اس پر وارد ہوں تو سلامتی کے ساتھ داخل ہوں اور اسے غنیمت کے ساتھ نکالے۔ اگر یہ کہا جائے کہ کیا انبیاء آگ میں داخل ہوں گے؟ ہم کہیں گے: ہم یہ مطلق نہیں کرتے بلکہ ہم کہتے ہیں: ساری مخلوق دوزخ پر وارد ہوگی جیسا کہ حضرت جابر کی حدیث اس پر دلالت کرتی ہے نافرمان اپنے جرائم کی وجہ سے دوزخ میں داخل ہوں گے، اولیاء اور سعادت مند ان مجرموں کی شفاعت کے لیے داخل ہوں گے پس ان دونوں دخولوں کے درمیان بہت بڑا فرق ہے۔ ابن انباری نے مصحف عثمان اور قرأت عامہ سے حجت پکڑتے ہوئے کہا: لغت میں جائز ہے کہ غائب سے مخاطب اور مخاطب سے غائب کی طرف التفات ہوتا رہتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ سَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا ۝ اِنَّ هٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَآءً وَّ كَانَ سَعْيُكُمْ مَّشْكُوْرًا ۝ (دہر) پہلے غائب کی ضمیریں تھیں پھر مخاطب کی ضمیریں ذکر فرمائیں؛ یہ مفہوم سورۂ یونس میں گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد میں الاتَحِلَّۃَ القسم یہ مستثنیٰ منقطع کا بھی احتمال رکھتا ہے لیکن تَحِلَّۃَ القسم یہ کلام عرب میں معروف ہے یعنی اسے آگ بالکل نہ چھوئے گی۔ یہاں کلام مکمل ہوئی پھر نئی کلام فرمائی اَلاتَحِلَّۃَ القسم یعنی لکن تَحِلَّۃَ القسم (قسم پوری قسم کرنے کے لیے ضروری ہے) جو کہ اس ارشاد میں ہے: وَ اِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا اور وہ پل صراط سے گزرنا ہو یا آگ کو دیکھنا یا سلامتی کے ساتھ داخل ہونا ہو پس اس میں کوئی مسیس نہ ہوگا کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "تم میں سے جن کے تین بچے فوت ہو جائیں گے پھر وہ ان پر ثواب کی امید رکھے گا تو وہ اس کے لیے دوزخ سے ڈھال ہوں گے" (1)۔ الجنۃ کا معنی ڈھال اور پردہ ہے۔ اور جو آگ سے بچایا گیا اور اس سے چھپایا گیا اس کو بالکل آگ نہ چھوئے گی اگر آگ اسے چھوتی تو وہ بچایا گیا نہ ہوتا۔

مسئلہ نمبر 4۔ یہ حدیث پہلی حدیث کی تفسیر ہے کیونکہ اس میں الحسبۃ کا ذکر ہے اسی وجہ سے امام مالک نے اپنے اثر کے ساتھ اس کو مفسر فرمایا ہے۔ اس دوسری حدیث کو اس نے مقید کیا ہے جو امام بخاری نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے اور انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے فرمایا: من مات لہ ثلاثۃ من الولد لم یبلغوا الحِنث کان لہ حجابا من النار او دخل الجنۃ (2)۔ پس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: لم یبلغوا الحنث، اہل علم کے نزدیک اس کا معنی یہ ہے کہ وہ اس عمر کو نہ پہنچے ہوں کہ ان پر گناہ لازم ہوتا ہو۔ یہ دلیل ہے کہ مسلمانوں کے بچے جنت میں ہوں گے، واللہ اعلم۔ کیونکہ رحمت جب ان کے آباء پر نازل ہوئی تو یہ محال ہے کہ جن کی وجہ سے دوسروں پر رحم کیا گیا ہو وہ خود مرحوم نہ ہوں۔ اس

1۔ مؤطا امام مالک، کتاب الجنائز، صفحہ 218

2۔ صحیح بخاری، کتاب الایمان والنذور، و أقسموا باللہ جهد ایمانهم، جلد 2، صفحہ 985

پر علماء کا اجماع ہے کہ مسلمانوں کے بچے جنت میں ہیں، اس میں مخالفت نہیں کی مگر جبریہ فرقہ نے انہوں نے اس کو مشیت کے ساتھ خاص کیا ہے۔ یہ ان کا اجماع کی وجہ سے مردود قول ہے جن کی مخالفت جائز نہیں اور نہ ان کی مثل پر غلطی جائز ہے نیز ثقہ عادل لوگوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اخبار آحاد روایت کی ہیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قول: الشقی من شقی فی بطن أمه والسعید من سعد فی بطن أمه وأن الملك ینزل فیکتب أجله وعمله ورزقه (1)۔ بدبخت وہ ہے جو اپنی ماں کے بطن میں بدبخت تھا اور سعید وہ ہے جو اپنی ماں کے بطن میں سعید تھا فرشتہ نازل ہوتا ہے وہ اس کی عمر اس کا عمل اور اس کا رزق لکھتا ہے۔ یہ حدیث مخصوص ہے مسلمانوں کے بچوں میں سے جو اکتساب سے پہلے مرجائے گا وہ وہ ہوگا جو اپنی ماں کے بطن میں سعید تھا اور وہ بدبخت نہیں تھا اس کی دلیل احادیث اور اجماع ہے، اسی طرح حضرت عائشہ کو نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اے عائشہ! اللہ تعالیٰ نے جنت کو پیدا کیا اور اس کے لیے رہنے والے بھی پیدا کیے جبکہ وہ اپنے آباء کی صلبوں میں تھے''۔ یہ اجماع اور آثار کی وجہ سے ضعیف اور مردود ہے۔ طلحہ بن یحییٰ جس نے اس حدیث کو روایت کیا ہے وہ ضعیف ہے قابل حجت نہیں۔ اس حدیث کے ساتھ وہ منفرد ہے اس لیے قبول نہیں۔ شعبہ عن معاویہ بن قرہ بن ایاس مزنی عن ابیہ عن النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سلسلہ سے مروی ہے کہ ایک انصاری کا چھوٹا بچہ فوت ہوگیا وہ اس پر بہت افسردہ ہوا اسے نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''کیا تجھے یہ خوشی نہیں کہ تو جنت کے دروازوں میں سے جس دروازے سے آئے تو تو اسے پائے کہ وہ تیرے لیے دروازہ کھولتا ہے'' (2)۔ یہ حدیث ثابت صحیح ہے ان احادیث کے معنی کے ساتھ جو ہم نے ذکر کی ہیں نیز جمہور کا اجماع بھی ہے۔ یہ صحیح حدیث یحییٰ کی حدیث کے معارض ہے اور اسے دور کرتی ہے۔ ابو عمر نے کہا: میرے نزدیک اس حدیث میں اور اس کے مشابہ آثار میں وجہ یہ ہے کہ یہ اس کے لیے ہے جس نے فرائض کی آدیگی کی محافظت کی، کبائر سے اجتناب کیا، مصیبت پر صبر کیا اور ثواب کی امید رکھی۔ خطاب اس زمانہ میں ایسی قوم کو تھا جن کا غالب اسی پر تھا وہ صحابہ کرام تھے۔ نقاش نے بعض علماء سے ذکر کیا ہے کہ: وَ اِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا کا قول منسوخ ہے اور اس کی ناسخ یہ آیت ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰۤی ۙ اُولٰٓىِٕكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ ۝ (الانبیاء) جس کو آگ نے نہیں چھوا وہی آگ سے دور کیا گیا ہے۔ حدیث میں ہے ''قیامت کے روز آگ مومن کو کہے گی: ''اے مومن! گزر جا تیرا نور میرے شعلہ کو بجھا رہا ہے'' (3)۔

مسئلہ نمبر 5۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كَانَ عَلٰی رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِیًّا ۝، الحتم کا معنی ہے فیصلہ کو واجب کرنا یعنی یہ حتمی تھا۔ مَّقْضِیًّا اللہ تعالیٰ نے یہ تم پر فیصلہ فرما دیا تھا۔ حضرت ابن مسعود نے کہا: یہ قسم واجب ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ نُنَجِّی الَّذِیْنَ اتَّقَوْا، یعنی ہم متقین کو نکالیں گے، وَّنَذَرُ الظّٰلِمِیْنَ فِیْهَا جِثِیًّا ۝ یہ آیت دلیل ہے کہ ورود سے مراد دخول ہے کیونکہ ندخل الظالمین نہیں فرمایا۔ اس پر تفصیلی بحث ہو چکی ہے۔ مذہب یہ ہے کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب اگرچہ دوزخ میں داخل ہوگا اسے اس کی بداعمالیوں کی مقدار سزا ملے گی پھر وہ نجات پائے گا۔ فرقہ مرجئہ نے کہا: وہ

1۔ صحیح بخاری، کتاب الجنائز، فضل من مات له ولد فاحتسب، جلد 1، صفحہ 167

2۔ التمہید جلد 6، صفحہ 349۔351۔ مسند امام احمد حدیث نمبر 24132 3۔ تفسیر طبری

بھی داخل نہ ہوگا۔ وعیدیہ نے کہا: گناہ کبیرہ کا مرتکب ہمیشہ دوزخ میں رہے گا۔ اس کا بیان کئی مقامات پر گزر چکا ہے۔ عاصم جحدری، معاویہ بن مرۃ نے ثم ننجی تخفیف کے ساتھ انجی سے پڑھا ہے؛ یہ حمید، یعقوب اور کسائی کی قرأت ہے اور باقی قراء نے شد کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابن ابی لیلیٰ نے ثمہ پڑھا ہے، یعنی وہاں، ثم ظرف ہے مگر یہ مبنی ہے کیونکہ غیر محصل ہے پس یہ مبنی ہوگا جیسے ذاہنی ہے اور ھاء یہ بھی جائز ہے کہ یہ حرکت کے بیان کے لیے ہو پس اسے وصل میں حذف کیا جائے گا اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ بقعہ کی تانیث کے لیے ہو پس وصل میں تاء ثابت ہوگی۔

وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا ۙ اَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ خَيْرٌ مَّقَامًا وَّ اَحْسَنُ نَدِيًّا ۝ وَ كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ هُمْ اَحْسَنُ اَثَاثًا وَّ رِءْيًا ۝ قُلْ مَنْ كَانَ فِي الضَّلٰلَةِ فَلْيَمْدُدْ لَهُ الرَّحْمٰنُ مَدًّا ۚ حَتّٰۤى اِذَا رَاَوْا مَا يُوْعَدُوْنَ اِمَّا الْعَذَابَ وَ اِمَّا السَّاعَةَ ؕ فَسَيَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّ اَضْعَفُ جُنْدًا ۝

''اور جب تلاوت کی جاتی ہیں ان کے سامنے ہماری آیتیں وضاحت سے (تو) کافر کہتے ہیں ایمان والوں سے کہ (یہ تو بتاؤ) ہم دونوں گروہوں میں سے کس کی رہائش گاہ آرام دہ ہے اور کس کی نشست گاہ خوبصورت ہے؟ اور (ان احمقوں نے یہ نہ سوچا) کہ کتنی قومیں ان سے پہلے تھیں جن کو ہم نے برباد کر دیا وہ ساز وسامان اور ظاہری سج دھج میں (ان سے) بہتر تھیں۔ آپ فرمایئے: جو گمراہی میں (مگن) ہو تو ڈھیل دیئے رکھتا ہے اسے رحمٰن لمبی ڈھیل یہاں تک کہ جب دیکھیں گے وہ چیز جس کا وعدہ کیا گیا ہے یعنی عذاب یا قیامت تو اس وقت انہیں پتہ چلے گا کہ کون مکان کے لحاظ سے برا اور لشکر کے اعتبار سے کمزور ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ یعنی ان کفار پر جب ہماری آیتیں پڑھی جاتی ہیں جن کا ذکر ءَاِذَا مَا مِتُّ لَسَوْفَ اُخْرَجُ حَيًّا ۝ میں گزر چکا ہے اور ان کے بارے میں فرمایا: وَّنَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا ۝ جب ان پر قرآن پڑھا جاتا ہے تو دنیا کی وجہ سے عزت والے بنتے ہیں اور کہتے ہیں: ہمیں کیا ہے اگر ہم باطل پر ہوئے ہم مال کے اعتبار سے زیادہ ہیں، نفری کے اعتبار سے معزز ہیں؟ ان کا مقصود کمزور لوگوں پر شبہ کو زائل کرنا اور ان کو وہم دلانا تھا کہ جس کا مال زیادہ ہوتا ہے یہ دلیل ہے کہ وہ اپنے دین میں حق پر ہے، گویا انہوں نے کفار میں کوئی فقیر نہیں دیکھا اور مسلمانوں میں کوئی غنی نہیں دیکھا۔ اور یہ انہیں معلوم نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنے اولیاء کو دنیا سے دھوکا کھانے اور کثرت سے اس کی طرف میلان سے دور رکھتا ہے۔ بَيِّنٰتٍ، کا معنی جن کے الفاظ میں ترتیل ہے اور معانی میں تلخیص ہے، مقاصد کو بیان کرنے والی ہیں۔ محکمات ہیں یا متشابہات ہیں محکمات کی وجہ سے ان کا بیان ان کے پیچھے موجود ہے یا نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے قولاً یا فعلاً بیان کیا ہے، ان کے ظاہر میں اعجاز ہے ان کے ساتھ چیلنج کیا گیا ہے کوئی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا یا یہ حجتیں اور براہین ہیں یہ حال مؤکدہ ہے جیسے اللہ

تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا (البقرہ: 91) کیونکہ آیات ہمیشہ واضح ہوتی ہیں اور حجتیں ہوتی ہیں۔ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اس سے مراد قریش کے مشرک ہیں نضر بن حرث اور اس کے ساتھی، لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اس سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فقراء صحابہ ہیں ان کی حالت بوسیدہ تھی ان کی زندگیوں میں خشونت تھی اور ان کے لباس پھٹے پرانے ہوتے تھے مشرک لوگ اپنے بالوں کو کنگھی کرتے تھے، اپنے سروں پر تیل لگاتے تھے اور عمدہ لباس پہنتے تھے انہوں نے مومنین سے کہا: اَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ خَيْرٌ مَّقَامًا وَّ اَحْسَنُ نَدِيًّا، ابن کثیر، ابن محیصن، حمید اور شبل بن عباد نے مقاماً میم کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے یعنی قیام کی جگہ، اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ الاقامة کے معنی میں مصدر میمی ہو اور باقی قراء نے مقاماً کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی منزل اور مسکن۔ بعض علماء نے فرمایا: مقام سے مراد وہ جگہ ہوتی ہے جس میں بڑے بڑے امور طے کیے جاتے ہیں یعنی دونوں فریقوں میں سے زیادہ جاہ وحشمت اور مددگاروں والا کون ہے؟ اَحْسَنُ نَدِيًّا، (1) ندیا سے مراد مجلس ہے؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، ان سے یہ بھی مروی ہے کہ اس سے مراد منظر ہے لغت میں مجلس کو النادی کہتے ہیں اسی سے دار الندوہ ہے کیونکہ مشرکین اس میں اپنے امور کا مشورہ کرتے تھے۔ ناداہ کا مطلب ہے مجلس میں اس نے اسے بٹھایا۔ شاعر نے کہا: أنادي به آل الوليد وجعفر الندی فعیل کے وزن پر قوم کے بیٹھنے کی جگہ اور گفتگو کی جگہ اسی طرح الندوہ، النادی، المنتدی، المتندی ہے اگر قوم بکھر جائے تو وہ ندی نہیں ہے؛ یہ جوہری نے کہا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ، قرن سے مراد امت اور جماعت ہے، هُمْ اَحْسَنُ اَثَاثًا زیادہ مال ومتاع مراد ہے۔ شاعر نے کہا:

وفرع يزين المتنَ أسودَ فاحم أثيث كقنوِ النَّخلةِ المُتَعَثْكِلِ

الاثاث سے مراد گھر کا ساز وسامان ہوتا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اثاث جو بچھایا جاتا ہے۔ الحرثی جو پہنا جاتا ہے۔ حسن بن علی طوسی نے یہ شعر کہا ہے:

تقادم العهد من أم الوليد بنا دهراً وصار أثاث البيت خُرْثِيّا

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اثاث سے مراد ہیئت ہے۔ مقاتل نے کہا: اس سے مراد کپڑے ہیں، وَّ رِءْيًا خوبصورت منظر، اس میں پانچ قراتیں ہیں: اہل مدینہ نے وریا، بغیر ہمزہ کے پڑھا ہے۔ اہل کوفہ نے ورئیا ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعقوب نے حکایت کیا ہے کہ طلحہ نے وریا ایک یاء مخففہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور سفیان نے اعمش سے انہوں نے ابوظبیان سے انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے: هم احسن اثاثا وزیا یعنی زاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ چار قرائتیں ہیں۔ ابواسحاق نے کہا: هم احسن اثاثا وریئا یعنی یا کے بعد ہمزہ کے ساتھ بھی جائز ہے۔ نحاس نے کہا: اہل مدینہ کی قرأت اس میں بہتر ہے اور اس میں دو تقریریں ہیں۔ (۱) یہ رایت سے مشتق ہو پھر ہمزہ میں تخفیف کی گئی ہو اور اسکو یاء سے بدل دیا گیا ہو اور پھر یاء کو یاء میں ادغام کیا گیا ہو۔ یہ بہتر ہے تاکہ آیات کے سرے متفق ہو جائیں کیونکہ وہ غیر مہموز

1۔ تفسیر طبری، جز 16، صفحہ 134

ہیں اس بنا پر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: الری کا مطلب منظر ہے بس معنی یہ ہے ھم احسن اثاثا ولباسا اور دوسری تقریر یہ ہے کہ أن جلودھم مرتویه من النعمة ان کی کھالیں نعمتوں سے سیراب تھیں۔ پس اس بنا پر ہمزہ جائز نہیں اور ورش کی روایت میں نافع اور ابن ذکوان نے ابن عامر سے ریئًا ہمزہ کے ساتھ پہلی وجہ پر ہوگا؛ یہ اہل کوفہ اور ابوعمرو کی قرأت ہے یہ اصل پر رأیت سے مشتق ہوگا۔ طلحہ بن مصرف کی قرأت ریا ایک یاء مخففہ کے ساتھ میں، اس کو غلط خیال کرتا ہوں۔ بعض نحویوں کا خیال ہے کہ اس کی اصل ہمزہ ہے پھر ہمزہ کو یا سے تبدیل کیا گیا پھر ایک یاء کو حذف کیا گیا۔ مہدوی نے کہا: ریئًا ہونا بھی جائز ہے یا کو تبدیل کیا گیا تو وہ ریا ہو گیا۔ پھر ہمزہ کی حرکت یا کی طرف نقل کی گئی اور اسے حذف کیا گیا، بعض نے وریا قلب کی بنا پر پڑھا ہے۔ یہ پانچویں قرأت ہے۔ سیبویہ نے راء بمعنی رأی حکایت کیا ہے۔ جوہری نے کہا: جس نے اس کو ہمزہ دیا ہے اس نے اسے رأیت سے مشتق کیا ہے اور اس سے مراد منظر ہے جس کو آنکھ اچھی حالت اور خوبصورت لباس میں دیکھتی ہے۔ ابوعبیدہ نے محمد بن نمیر ثقفی نے کہا:

أشاقتك الظعائن يوم بانوا بذي الرئي الجميلِ من الأثاث

اور جنہوں نے اس کو ہمزہ نہیں دیا یا تو وہ ہمزہ کی تخفیف کی بنا پر ہے یا وہ رَویت ألوانهم وجلودهم ریا سے مشتق ہوگا، جس کا معنی ہے ان کے رنگ اور کھالیں بھری ہوئی اور خوبصورت تھیں۔ رہی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت ابی بن کعب اور سعید بن جبیر اور اعسم مکی اور یزید بربری کی قرأت وزیا، زاء کے ساتھ اس کا معنی بھی ہیئت اور خوبصورت ہے۔ یہ جائز ہے کہ یہ زویت سے مشتق ہو یعنی جمع کی گئی اس کی اصل زویا ہوگی واؤ کو یاء سے بدلا گیا ہے اسی سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے: زویت لی الأرض (1) زمین میرے لیے لپیٹ دی گئی یعنی اللہ تعالیٰ کے عذاب سے کوئی چیز بھی فائدہ نہ دے گی۔ یہ لوگ جتنا چاہیں زندگی گزاریں پس انہیں موت اور عذاب کی طرف لوٹنا ہے اگرچہ وہ کتنی لمبی عمر پائیں یا جلدی پہنچنے والا عذاب مراد ہے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ ان کی معرفت کرے گا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ مَنْ كَانَ فِي الضَّلٰلَةِ، یہاں ضلالت سے مراد کفر ہے۔ فَلْيَمْدُدْ لَهُ الرَّحْمٰنُ مَدًّا یعنی اس کی جہالت اور کفر کی سرکشی میں اسے چھوڑے رکھتا ہے۔ صیغہ امر کا ہے لیکن اس کا معنی خبر ہے یعنی جو گمراہی میں ہوگا اللہ تعالیٰ اسے ڈھیل دے گا حتیٰ کہ اس کا غرور بڑھتا جائے پس وہ اس کے عقاب کو مزید سخت کر دے گا اس کی مثال یہ ہے: اِنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ لِيَزْدَادُوْٓا اِثْمًا (آل عمران: 178) اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَنَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۱۱۰﴾ (الانعام) اس کی مثالیں بہت سی ہیں یعنی جتنا چاہے زندہ رہے اپنی عمر میں اپنے لیے وسعت کرے۔ اس کا انجام موت اور عقاب ہی ہوگا۔ یہ شدید دعید اور دھمکی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ دعا ہے جس کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے۔ تو کہتا ہے: من سرق مالی فلیقطع الله تعالی یده، جو میرا مال چوری کرے گا اللہ تعالیٰ اس کا ہاتھ کاٹے۔ یہ چور کے خلاف بددعا ہے یہ جواب شرط ہے اس بنا پر فلیمدد خبر نہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: حَتّٰٓى اِذَا رَاَوْا مَا يُوْعَدُوْنَ، راوْ، فرمایا کیونکہ لفظ مَنْ واحد اور جمع کی صلاحیت رکھتا ہے اور اذا

1۔ ابن ماجہ، کتاب الفتن، باب ما یکون من الفتن، حدیث نمبر 3941، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ماضی کے ساتھ بھی مستقبل کا معنی دیتا ہے، یعنی حتیٰ کہ وہ دیکھ لیں گے جو ان سے وعدہ کیا گیا ہے۔ العذاب سے یہاں مراد ان کے خلاف مومنین کی مدد کر کے عذاب دینا ہے پس وہ تلوار اور قیدی بنا کر انہیں عذاب دیں گے یا قیامت قائم ہوگی پس اور وہ آگ کی طرف جائیں گے۔ فَسَيَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّ اَضْعَفُ جُنْدًا ۝ اس وقت حقائق منکشف ہوں گے۔ یہ ان کے قول: اَیُّ الْفَرِیْقَیْنِ۔۔۔ الخ کا رد ہے۔

وَ يَزِيْدُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اهْتَدَوْا هُدًى ؕ وَ الْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّ خَيْرٌ مَّرَدًّا ۝

''اور زیادہ کرتا رہتا ہے اللہ تعالیٰ ہدایت یافتہ لوگوں (کے نور) ہدایت کو، اور باقی رہنے والی نیکیاں بہتر ہیں آپ کے رب کے نزدیک ثواب کے اعتبار سے اور انہی کا انجام اچھا ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ يَزِيْدُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اهْتَدَوْا هُدًى اللہ تعالیٰ مومنین کو ہدایت پر ثابت قدم رکھتا ہے اور ان کی نصرت میں اضافہ کرتا ہے اور ایسی آیات نازل فرماتا ہے جو یقین میں زیادتی کا سبب ہوتی ہیں یہ ان کی جزا کے لیے ہوتا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اور ناسخ و منسوخ کی تصدیق کی وجہ سے ان کی ہدایت میں اضافہ کرتا ہے جس کا دوسرے لوگ انکار کرتے ہیں؛ یہ معنی کلبی اور مقاتل نے بیان کیا ہے۔ ایک تیسرا احتمال بھی ہے وَ يَزِيْدُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اهْتَدَوْا یعنی ہدایت یافتہ لوگوں کی جنت میں اضافہ کرتا ہے۔ یہ مفہوم پہلے مفہوم کے قریب ہی ہے۔ اعمال کی زیادتی اور ایمان و ہدایت کی زیادتی کا مفہوم سورۂ آل عمران میں گزر چکا ہے۔ وَ الْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ اس پر گفتگو سورۃ الکہف میں گزر چکی ہے۔ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا ثوابا سے مراد جزا ہے۔ وَّ خَيْرٌ مَّرَدًّا ۝ آخرت میں بہتر انجام ہوگا اس سے جس کے ساتھ دنیا میں کفار فخر کرتے تھے۔ المراد مصدر ہے جیسے الرد ہے، یعنی نیکیاں کرنے والے پر بہتر ثواب لوٹایا جائے گا، کہا جاتا ہے: هذا رد عليك یعنی میں تجھے نفع دوں گا۔ بعض علماء نے فرمایا: خَيْرٌ مَّرَدًّا ۝ یعنی بہتر مرجع، ہر ایک اپنے اس عمل کی طرف لوٹایا جائے گا جو اس نے عمل کیا۔

اَفَرَءَيْتَ الَّذِيْ كَفَرَ بِاٰيٰتِنَا وَ قَالَ لَاُوْتَيَنَّ مَالًا وَّ وَلَدًا ۝ اَطَّلَعَ الْغَيْبَ اَمِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ۝ كَلَّا ؕ سَنَكْتُبُ مَا يَقُوْلُ وَ نَمُدُّ لَهٗ مِنَ الْعَذَابِ مَدًّا ۝ وَّ نَرِثُهٗ مَا يَقُوْلُ وَ يَاْتِيْنَا فَرْدًا ۝

''کیا آپ نے دیکھا اس کو جس نے انکار کیا ہماری آیتوں کا اور کہنے لگا کہ مجھے ضرور ضرور دیا جائے گا مال اور اولاد (اس لاف زنی کی وجہ کیا ہے) کیا وہ آگاہ ہوگیا ہے غیب پر یا لے لیا ہے اس نے (خداوند) رحمٰن سے کوئی وعدہ، ہرگز ایسا نہیں، ہم لکھ لیں گے جو یہ کہہ رہا ہے اور لمبا کردیں گے اس کے لیے عذاب کو خوب لمبا کرنا۔ اور ہم ہی وارث ہوں گے جو وہ کہتا ہے (یعنی اس کے مال و اولاد کے) اور وہ ہمارے پاس تنہا آئے گا''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَفَرَءَيْتَ الَّذِيْ كَفَرَ بِاٰيٰتِنَا، آئمہ حدیث نے یہ الفاظ مسلم شریف کے ہیں، حضرت خباب سے

روایت کیا ہے(1) فرمایا: میرا عاص بن وائل پر قرض تھا میں اس سے وہ قرض طلب کرنے کے لیے آیا، تو اس نے مجھے کہا: میں تجھے قرض ادا نہیں کروں گا حتی کہ تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا انکار کرے۔ حضرت خباب نے فرمایا: میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار نہیں کروں گا حتی کہ تو مرجائے پھر اٹھایا جائے۔ عاص نے کہا میں مرنے کے بعد اٹھایا جاؤں گا؟ تو پھر میں اس وقت تجھے قرضہ ادا کروں گا جب میں اپنے مال اور اولاد کی طرف لوٹوں گا۔ وکیع نے کہا: اعمش نے اسی طرح کہا ہے، تو یہ آیت نازل ہوئی: اَفَرَءَيْتَ الَّذِىْ كَفَرَ بِاٰيٰتِنَا وَ قَالَ لَاُوْتَيَنَّ مَالًا وَّ وَلَدًا ۞ ۔۔۔۔ وَ يَاْتِيْنَا فَرْدًا ۞۔ ایک روایت میں ہے میں زمانہ جاہلیت میں کاریگر تھا میں نے عاص بن وائل کے لیے کام کیا تو میں نے اس سے رقم کا مطالبہ کیا۔ بخاری نے اس کو نقل کیا ہے۔ کلبی اور مقاتل نے کہا: حضرت خباب کاریگر تھا اس نے عاص کے لیے کوئی زیور بنایا پھر اس سے اجرت کا مطالبہ کیا۔ عاص نے کہا: آج میرے پاس وہ نہیں ہے جو میں تجھے ادا کروں۔ حضرت خباب نے کہا: میں تجھے نہیں چھوڑوں گا حتی کہ تو مجھے میرا قرض ادا کرے۔ عاص نے کہا: اے خباب! تجھے کیا ہوا؟ تو ایسا تو نہیں تھا تو تو بہت اچھے طریقہ سے مطالبہ کرتا تھا۔ حضرت خباب نے کہا: پہلے میں تیرے دین پر تھا آج میں دین اسلام پر ہوں تیرے دین کو چھوڑنے والا ہوں۔ اس نے کہا: کیا تم ہی نہیں کہتے کہ جنت میں سونا، چاندی اور ریشم ہے؟ حضرت خباب نے کہا: کیوں نہیں۔ عاص نے کہا: تو مجھے مہلت دے میں تجھے جنت میں ادا کروں گا۔ اس نے استہزاءً یہ کہا۔ اللہ کی قسم! تو اور تیرے ساتھی جنت کے مجھ سے زیادہ حقدار نہ ہوں گے۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: اَفَرَءَيْتَ الَّذِىْ كَفَرَ بِاٰيٰتِنَا یعنی عاص بن وائل۔ اَطَّلَعَ الْغَيْبَ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس کا معنی ہے کیا اس نے لوح محفوظ میں دیکھا ہے؟ مجاہد نے کہا: کیا اس نے غیب جان لیا ہے حتی کہ وہ جانتا ہے کہ کیا وہ جنت میں ہے یا نہیں۔ اَمِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ۞ قتادہ اور ثوری نے کہا: یعنی اس نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کوئی عمل صالح کیا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: عَهْدًا سے مراد توحید ہے۔ بعض نے فرمایا: وعدہ ہے۔ کلبی نے کہا: اللہ تعالیٰ نے اس سے عہد کیا ہے کہ وہ اسے جنت میں داخل کرے گا۔ كَلَّا یہ اس پر رد ہے یعنی ایسا کچھ بھی نہیں ہے نہ وہ غیب پر مطلع ہے اور نہ اللہ تعالیٰ سے کوئی عہد لیا ہے۔ كَلَّا پر کلام مکمل ہوئی۔ حسن نے کہا: یہ آیات ولید بن مغیرہ کے بارے میں نازل ہوئیں۔ پہلا قول اصح ہے کیونکہ وہ صحاح میں موجود ہے۔ حمزہ اور کسائی نے وُلْدًا واؤ کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقی لوگوں نے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ضمہ اور فتحہ میں دو وجہ سے اختلاف کیا گیا ہے: (1) یہ دونوں لغتیں ہیں اور دونوں کا معنی ایک ہے۔ کہا جاتا ہے: وَلَدٌ، وُلْدٌ جیسے کہا جاتا ہے: عَدَمٌ وعُدْمٌ۔ حرث بن حلزہ نے کہا:

ولقد رأيتُ معاشراً قد ثمّروا مالاً ووُلْداً(2)

دوسرے نے کہا:

فليتَ فلاناً كان في بطنِ أُمّه وليتَ فلاناً كان وُلْدَ حمارِ(3)

1۔ جامع ترمذی، کتاب فضائل القرآن، باب ماجاء فی سورۃ مریم، جلد 2، صفحہ 145

2۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 130

3۔ ایضاً

(۲) دوسری وجہ یہ ہے کہ قیس ولد کو واؤ کے ضمہ کے ساتھ جمع بناتے ہیں اور فتحہ کے ساتھ واحد بناتے ہیں۔ ماوردی نے کہا: لَاُوْتَيَنَّ مَالًا وَّوَلَدًا میں دو وجہیں ہیں: ایک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی طاعت وعبادت پر جنت کا جو وعدہ فرمایا ہے اس کا مزاح کرتے ہوئے اس نے یہ کہا، یہ کلبی کا قول ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اس نے دنیا میں ان چیزوں کا ارادہ کیا؛ یہ جمہور کا قول ہے۔ اس میں دو احتمال ہیں۔ (۱) اگر میں اپنے آباء کے دین پر اور اپنے خداؤں کی عبادت پر قائم رہا تو مجھے مال اور اولاد دی جائے گی۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ اگر میں باطل پر ہوتا تو مجھے مال اور اولاد نہ دی جاتی۔

میں کہتا ہوں: کلبی کا قول ظاہر احادیث کے زیادہ مناسب ہے بلکہ احادیث کی نص اس پر دلیل ہے۔ مسروق نے کہا: میں نے حضرت خباب بن ارت کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں عاص بن وائل کے پاس آیا تا کہ اس سے اپنے قرض کا مطالبہ کروں اس نے کہا: میں تجھے قرض نہیں دوں گا حتی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کرے۔ میں نے کہا: نہیں، حتی کہ تو مرجائے اور پھر اٹھایا جائے۔ عاص نے کہا: میں مروں گا پھر اٹھایا جاؤں گا؟ میں نے کہا: ہاں۔ عاص نے کہا: میرے لیے وہاں مال اور اولاد ہوگی تو میں تجھے قرضہ ادا کردوں گا تو یہ آیت نازل ہوئی: اَفَرَءَيْتَ الَّذِيْ كَفَرَ بِاٰيٰتِنَا ترمذی نے کہا: یہ حدیث حسن صحیح ہے (1)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَطَّلَعَ الْغَيْبَ اس کا الف، الف استفہام ہے کیونکہ اس کے بعد أم آیا ہے اس کا معنی توبیخ ہے۔ اس کی اصل أاطلع ہے۔ پھر دوسرے الف کو حذف کیا گیا کیونکہ الف وصل ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ الف کے بعد مدّ کو کیوں نہیں لائے اور کہتے: آطلع جس طرح کہا: آٰللّٰهُ خَيْرٌ (النمل: 59) ءٰٓالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ (الانعام: 143) تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان آیات میں اصل أالله، أالذ کرین ہے پس دوسرے الف کو مد سے بدلا تا کہ استفہام اور خبر کے درمیان فرق ہو جائے اگر الله خیر بغیر مد کے کہتے تو استفہام خبر کے ساتھ ملتبس ہو جاتا اور اطلع میں اس مد کی ضرورت محسوس نہ کی کیونکہ الف استفہام میں مفتوح ہے اور خبر کا الف مکسور ہے، اسی وجہ سے تو استفہام میں کہتا ہے: أطلع؟ أفترى؟ أستغفرت؟۔ الف کے فتحہ کے ساتھ اور خبر میں تو کہتا ہے: اِطلع، اِفترى، اِصطفى اِستغفرت لهم۔ یہ تمام ہمزہ مکسورہ کے ساتھ ہیں پس انہوں نے فتحہ اور کسرہ کے درمیان فرق کیا ہے اور دوسرے فرق کی ضرورت محسوس نہ کی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كَلَّا قرآن کے نصف اوّل میں کلا کا ذکر نہیں ہے۔ نصف ثانی میں اس کا ذکر آیا ہے۔ اس کے دو معانی ہیں۔ ایک اس کا معنی ہے حقا اور دوسرا اس کا معنی ہے نہیں۔ جب یہ حقا کے معنی میں ہو تو اس کے ماقبل پر وقف جائز ہے پھر کلا سے آغاز ہوگا اور جب یہ لا کے معنی میں ہوگا تو کلا پر وقف جائز ہوگا جیسا کہ اس آیت میں ہے کیونکہ اس کا معنی ہے نہیں معاملہ اس طرح نہیں ہے اور عهدا پر وقف کرنا اور کلا سے آغاز کرنا بھی جائز ہے یعنی كَلَّا سَنَكْتُبُ مَا يَقُوْلُ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: لَعَلِّيْٓ اَعْمَلُ صَالِحًا فِيْمَا تَرَكْتُ كَلَّا (المومنون: 100) اس میں کلا پر اور ترکت پر وقف جائز ہے اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَهُمْ عَلَيَّ ذَنْۢبٌ فَاَخَافُ اَنْ يَّقْتُلُوْنِ ۝ قَالَ كَلَّا (الشعراء) اس میں وقف کلا پر ہے کیونکہ اس کا معنی ہے نہیں یعنی معاملہ اس طرح نہیں جیسا کہ تم گمان کر رہے ہو۔ فاذهبا تم دونوں جاؤ۔ اس میں حق کے معنی

1۔ جامع ترمذی، کتاب فضائل القرآن، باب ومن سورة مريم، حدیث نمبر 3086، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

میں ہونے کی جگہ نہیں۔ فراء نے کہا: کلا، سوف کے قائم مقام ہے کیونکہ یہ صلہ ہے اور یہ حرف رد ہے گویا نعم (ہاں) اور لا (نہیں) ہے اگر تو اسے مابعد کے لیے صلہ بنائے تو اس پر وقف نہیں کرے گا جیسے تیرا قول ہے: کلا و رب الکعبہ، کلا پر وقف نہیں کرے گا کیونکہ یہ ای و رب الکعبہ کے قائم مقام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: كَلَّا وَالْقَمَرِ ﴿۳۲﴾ (المدثر) پس کلا پر وقف قبیح ہے کیونکہ یہ الیمین کا صلہ ہے۔ ابوجعفر محمد بن سعدان کلا میں فراء کے قول کی طرح فرماتے تھے۔ اخفش نے کہا: کلا کا معنی جھڑکنا اور روکنا ہے۔ ابوبکر انباری نے کہا: میں نے ابوالعباس کو یہ فرماتے ہوئے سنا پورے قرآن میں کلا پر وقف نہیں کیا جائے گا کیونکہ یہ جواب ہے اور اس کا فائدہ مابعد میں واقع ہوتا ہے۔ پہلا قول اہل تفسیر کا قول ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: سَنَكْتُبُ مَا يَقُوْلُ یعنی ہم اس کے قول کو اس پر محفوظ کرلیں گے اور آخرت میں اس کی وجہ سے اسے سزا دیں گے۔ وَنَمُدُّ لَهٗ مِنَ الْعَذَابِ مَدًّا ﴿۷۹﴾ ہم اس کے عذاب پر عذاب کا اضافہ کریں گے۔ وَنَرِثُهٗ مَا يَقُوْلُ اور ہم نے جو اسے دنیا میں مال اور اولاد عطا کی ہے وہ ہم چھین لیں گے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ نے فرمایا: اس کا مطلب ہے ہم اسے ہلاک کرنے کے بعد مال اور اولاد کے وارث بن جائیں گے۔ بعض نے فرمایا: ہم اسے اس خواہش سے آخرت میں محروم کردیں گے جو وہ مال اور اولاد کی رکھتا ہے اور ہم اس کے علاوہ دوسرے مسلمانوں کو دیں گے۔ وَيَاْتِيْنَا فَرْدًا ﴿۸۰﴾ وہ ہماری بارگاہ میں متفرد آئے گا نہ اس کے لیے مال ہوگا، نہ اولاد اور نہ خاندان جو اس کی مدد کرتا ہوگا۔

وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّيَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا ﴿۸۱﴾ كَلَّا ؕ سَيَكْفُرُوْنَ بِعِبَادَتِهِمْ وَ يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا ﴿۸۲﴾

"اور انہوں نے بنالیے ہیں اللہ تعالیٰ کے سوا اور خدا کہ وہ ان کے لیے مددگار بنیں۔ ہرگز نہیں وہ جھوٹے خدا انکار کردیں گے ان کی عبادت کا اور وہ (الٹے) ان کے دشمن ہوجائیں گے"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّيَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا ﴿۸۱﴾ اس سے مراد مشرکین ہیں۔ عِزًّا اس کا معنی ہے مددگار اور محافظ، یعنی اولاد، العز موسلادھا بارش کو بھی کہتے ہیں؛ یہ ہروی کا قول ہے۔ کلام کا ظاہر یہ ہے کہ عِزًّا ان بتوں کی طرف راجع ہے جن کی وہ اللہ کو چھوڑ کر عبادت کرتے تھے۔ اور اس کو واحد ذکر فرمایا کیونکہ یہ مصدر کے معنی میں ہے یعنی تاکہ وہ اس کے ساتھ عزت پائیں اور ان کے ذریعے اللہ کے عذاب سے محفوظ ہوجائیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: كَلَّا، معاملہ اس طرح نہیں جس طرح انہوں نے گمان کیا بلکہ وہ ان کی عبادت کا انکار کریں گے یعنی وہ انکار کریں گے کہ انہوں نے بندوں کی عبادت کی تھی یا وہ بت مشرکوں کی عبادت کا انکار کریں گے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تَبَرَّاْنَاۤ اِلَيْكَ ؗ مَا كَانُوْۤا اِيَّانَا يَعْبُدُوْنَ ﴿۶۳﴾ (القصص) اور یہ بت جمادات ہیں عبادت کا علم نہیں رکھتے۔

وَيَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا ﴿۸۲﴾، ضدا کا معنی ہے انکی خصومت وتکذیب میں ان کے خلاف مددگار رہوں گے۔ مجاہد نے کہا: اس کا معنی ہے وہ ان کے دشمن ہوں گے۔ ابن زید نے کہا: وہ ان پر مصیبت ہوں گے پس ان کے معبودوں کو جمع کیا جائے گا اور ان کو عقل دی جائے گی اور وہ بولیں گے اور کہیں گے: یارب! ان کو عذاب دے جنہوں نے تجھے چھوڑ کر ہماری عبادت کی۔

کلاَّ یہاں یہ احتمال رکھتا ہے کہ یہ لا کے معنی میں ہو اور یہ بھی احتمال رکھتا ہے کہ حقاً کے معنی میں ہو۔ سَیَكْفُرُوْنَ بِعِبَادَتِهِمْ ابونہیک نے، کلاً سیکفرون یعنی تنوین کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور ان سے اس کے ساتھ کاف کا ضمہ اور فتحہ بھی مروی ہے۔ مہدوی نے کہا: کلاَّ زجر و تنبیہ ہے اور یہ پہلی کلام کے رد کے لیے ہوتا ہے اور کبھی مابعد کی تحقیق اور اس پر تنبیہ کے لیے واقع ہوتا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰۤى ۙ (العلق) اس معنی پر وقف نہیں کیا جاتا اور پہلے معنی پر اس پر وقف کیا جاتا ہے اگر اس میں دو معانی کی صلاحیت ہو تو اس پر وقف اور ابتدا جائز ہوتی ہے۔ اور جنہوں نے کلا کو تنوین دی ہے اور کاف کو فتحہ بھی دیا ہے تو وہ کلّ کا مصدر ہے اور اس کو نصب فعل مضمر کی وجہ سے ہے معنی یہ ہے: کل هذا الرأی والإعتقاد کلاً یعنی ان مورتیوں کو معبود بنانے کا اعتقاد اور نظریہ ہرگز درست نہیں تا کہ وہ ان کے مددگار ہوں۔ پس اس مفہوم پر عزاً اور کلاً پر وقف ہوگا؛ اسی طرح جماعت کی قرأت میں ہے کیونکہ یہ ماقبل کے رد اور مابعد کی تحقیق کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اور جنہوں نے تنوین کے ساتھ کاف کا ضمہ روایت کیا ہے وہ بھی فعل مضمر کے ساتھ منصوب ہے۔ گویا فرمایا: سیکفرون، كَلًّا سَیَكْفُرُوْنَ بِعِبَادَتِهِمْ، یعنی اپنے بتوں کی عبادت کا انکار کریں گے۔

میں کہتا ہوں: کلاَّ میں چار معانی حاصل ہوتے ہیں: (۱) تحقیق یعنی یہ حقا کے معنی میں ہوتا ہے۔ (۲) نفی، (۳) تنبیہ، (۴) قسم کا صلہ۔ صرف پہلی صورت میں اس پر وقف ہوگا۔ کسائی نے کہا: لا صرف نفی کرتا ہے اور کلاَّ ایک چیز کی نفی کرتا ہے اور ایک چیز کو ثابت کرتا ہے جب کہا جاتا ہے: اکلت تمراً تو تو کہتا ہے: کلا إنی أكلت عسلا لا تمراً میں نے شہد کھایا، کھجور نہیں کھائی۔ اس کلمہ میں ماقبل کی نفی ہے اور مابعد کی تحقیق ہے۔ الضد کبھی واحد ہوتا ہے اور کبھی جمع ہوتا ہے جیسے العدو اور الرسول واحد اور جمع استعمال ہوتے ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: الضد مصدر کی جگہ واقع ہے یعنی وہ ان کے علاوہ معاون ہوں گے اسی وجہ سے جمع نہیں ذکر کیا گیا، یہ چونکہ لِيَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا کے مقابلہ میں ہے اور العز مصدر ہے پس اسی طرح اس کے مقابلہ میں واقع ہوا ہے۔ پھر علماء نے فرمایا: یہ آیت بتوں کے پجاریوں کے متعلق ہے اور بتوں کو شعور والوں کے قائم مقام رکھا گیا ہے جیسے کہ کفار کا نظریہ تھا۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ ان کے بارے ہے جو مسیح علیہ السلام یا ملائکہ یا جن یا شیاطین کی عبادت کرتے تھے۔ واللہ اعلم۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّاۤ اَرْسَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ تَؤُزُّهُمْ اَزًّا ﴿۸۳﴾ فَلَا تَعْجَلْ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّمَا نَعُدُّ لَهُمْ عَدًّا ﴿۸۴﴾ يَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِيْنَ اِلَى الرَّحْمٰنِ وَفْدًا ﴿۸۵﴾ وَّنَسُوْقُ الْمُجْرِمِيْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ وِرْدًا ﴿۸۶﴾ لَا يَمْلِكُوْنَ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ﴿۸۷﴾

''کیا آپ نے ملاحظہ نہیں کیا کہ ہم نے مسلط کر دیا ہے شیطانوں کو کفار پر وہ انہیں (اسلام کے خلاف) ہر وقت اُکساتے رہتے ہیں۔ پس عجلت نہ کیجئے ان پر (نزول عذاب کے لیے) ہم گن رہے ہیں ان کے ایام زندگی کو اچھی طرح۔ وہ دن جب ہم اکٹھا کریں گے پرہیزگاروں کو رحمٰن کے حضور میں (معزز و مکرم مہمان بنا کر) اور

اس روز ہانک کر لائیں گے مجرموں کو جہنم کی طرف پیاسے جانوروں کی طرح۔ انہیں کوئی اختیار نہ ہو گا شفاعت کا بجز ان کے جنہوں نے خداوند رحمٰن سے کوئی وعدہ لے لیا ہے"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلَمْ تَرَ اَنَّاۤ اَرْسَلْنَا الشَّیٰطِیْنَ عَلَى الْكٰفِرِیْنَ ہم نے شیطانوں کو ان پر اغوا کرنے کے لیے مسلط کر دیا ہے یہ اس وقت ہوا جب ابلیس سے کہا تھا: وَ اسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ (بنی اسرائیل: 64)

بعض نے فرمایا: اَنَّاۤ اَرْسَلْنَا کا معنی ہے ہم نے چھوڑ دیا ہے۔ کہا جاتا ہے: أرسلت البعير میں نے اونٹ کو چھوڑ دیا ہے یعنی ہم نے شیطانوں اور ان کو چھوڑ دیا ہے ہم ان کی شیطانوں کی بات قبول کرنے سے حفاظت نہیں کرتے۔ زجاج نے اَرْسَلْنَا کا معنی قیضنا (ہم نے مسلط کر دیا) کیا ہے۔ تَؤُزُّهُمْ اَزًّا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس کا معنی ہے وہ انہیں طاعت کی جگہ معصیت اور نافرمانی پر اکساتے ہیں۔ ان سے مروی ہے تعزیهم اغراء بالشر وہ انہیں شر پر ابھارتے ہیں اس میں جاری رہو اس میں جاری رہو، حتی کہ وہ انہیں آگ میں ڈال دیتے ہیں۔ پہلا معنی ثعلبی نے اور دوسرا ماوردی نے حکایت کیا۔ مفہوم ایک ہی ہے۔ ضحاک نے کہا: تغويهم اغواء، وہ انہیں گمراہ کرتے ہیں۔ مجاہد نے کہا: ابھارتے ہیں۔ اس کا اصل معنی حرکت کرنا اور ابھرنا ہے؛ اسی سے خبر مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم قام إلى الصلاة ولجوفه أزير كأزيز المرجل من البكاء (1) جب نماز کے لیے کھڑے ہوئے تو آپ کے اندر سے رونے کی وجہ سے ابلنے کی آواز آئی جیسے ہانڈی ابلتی ہے۔ جب ہانڈی ابل رہی ہو تو کہتے ہیں: ائتزت القدر ائتزازاً۔۔۔ الازّ، کا معنی اُبھارنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَلَمْ تَرَ اَنَّاۤ اَرْسَلْنَا الشَّیٰطِیْنَ عَلَى الْكٰفِرِیْنَ تَؤُزُّهُمْ اَزًّا ﴿۸۳﴾ یعنی وہ انہیں گناہوں پر اکساتے ہیں۔ الازّ کا معنی الإختلاط بھی ہے قد أززت الشئ أؤزه ازاً میں نے بعض کو بعض سے ملا دیا، یہ جوہری کا قول ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَا تَعْجَلْ عَلَیْهِمْ یعنی ان کے لیے جلدی عذاب طلب نہ کرو، اِنَّمَا نَعُدُّ لَهُمْ عَدًّا، کلبی نے کہا: اس کا معنی ہے ہم ان کے ایام، راتیں، مہینے، سال عذاب کے پہنچنے تک شمار کر رہے ہیں۔ ضحاک نے کہا: اس کا مطلب ہے ہم ان کے سانس گن رہے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ہم دنیا میں ان کے سانس گن رہے ہیں جس طرح ہم ان کے سال گن رہے ہیں۔ بعض نے فرمایا: ہم ان کے قدم گن رہے ہیں۔ بعض نے فرمایا: ہم ان کی لذات گن رہے ہیں۔ بعض نے فرمایا: لحات گن رہے ہیں۔ بعض نے فرمایا: آپ ان کے لیے جلدی نہ کریں، ہم ان کو مہلت دے رہے ہیں تاکہ یہ گناہ زیادہ کر لیں۔ روایت ہے کہ مامون نے یہ سورت پڑھی اس آیت پر گزرا تو اس نے ابن سماک کی طرف اپنے سر سے اشارہ کیا تاکہ وہ نصیحت پکڑے، اس کے پاس فقہاء کی جماعت بیٹھی تھی اس نے کہا: جب سانس گنے جا رہے ہیں تو پھر ان کے لیے کوئی مدد نہیں ہے اور کتنے جلدی وہ ختم ہونے والے ہیں۔ اسی مفہوم میں شاعر نے کہا:

حیاتك انفاسٌ تُعدّ فكلّما مَضَى نَفَسٌ منك انتقصت به جُزْءا

يميتك ما يحييك في كل ليلة ويَحْدُوك حَادٍ ما يريد به الهُزءا

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، البکاء فی الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 130، ایضاً حدیث نمبر 769، روایت بالمعنی، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کہا جاتا ہے: انسان ایک دن اور رات میں چوبیس ہزار سانس لیتا ہے بارہ ہزار سانس دن میں اور بارہ ہزار رات میں لیتا ہے۔ یہ شمار ہو چکے ہیں ان کی تعداد معلوم ہے، ان کے لیے کوئی لمبائی و مدد نہیں ہے اور یہ کتنے جلدی ختم ہونے والے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِينَ إِلَى الرَّحْمٰنِ وَفْدًا اس کلام میں حذف ہے یعنی رحمٰن کی جنت کی طرف اور اس کے دار کرامت کی طرف متقین کو لے جائیں گے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: إِنِّي ذَاهِبٌ إِلَىٰ رَبِّي سَيَهْدِينِ (الصافات)

اسی طرح حدیث میں ہے: من کانت هجرته إلی الله ورسوله فهجرته إلی الله ورسوله، (1) جس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہے تو اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہے۔ الوفد اسم ہے وافدین کا، جیسا کہا جاتا ہے: صوم فطر و زور، یہ وافد کی جمع ہے جیسے رکب و راکب، صحب و صاحب یہ وفد یفد وفداً و وفوداً و وفادۃ سے مشتق ہے جب کوئی فتح یا کسی خطیر امر کی صورت میں بادشاہ کی طرف جائے۔ جوہری نے کہا: وفد فلان علی الأمیر کہا جاتا ہے یعنی وہ پیغام رساں بن کر آیا، فھو وافدٌ اس کی جمع وفدٌ ہے جیسے صاحب کی جمع صحبٌ ہے وفد کی جمع وفاد اور وفود ہے اور اسم الوفادۃ ہے: أوفدته أنا إلی الأمیر یعنی میں نے اسے امیر کی طرف بھیجا۔ اور تفسیر میں ہے وفداً یعنی وہ اپنی طاعتوں کی سواریوں پر سوار ہو کر حاضر ہوں گے۔ یہ اس لیے ہے کہ عام طور پر آنے والا سفیر سوار ہوتا ہے۔ الوفد سے مراد سوار ہیں۔ اس کو مفرد ذکر کیا گیا ہے کیونکہ یہ مصدر ہے۔ ابن جریج نے کہا: وفداً علی النجائب سواری پر سوار ہو کر آئیں گے۔ عمرو بن قیس ملائی نے کہا: مومن جب اپنی قبر سے نکلے گا تو اس کا عمل حسین صورت اور پاکیزہ خوشبو کی صورت میں اس کا استقبال کرے گا، وہ کہے گا: کیا تو مجھے جانتا ہے۔ مومن کہے گا: نہیں مگر اللہ تعالیٰ نے تیری خوشبو بہت اچھی بنائی اور تیری صورت حسین بنائی ہے۔ وہ کہے گا: میں دنیا میں اسی طرح تھا میں تیرا نیک عمل ہوں، دنیا میں میں تجھ پر سوار رہا آج تو مجھ پر سوار ہو، پھر یہ آیت تلاوت کی: يَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِينَ إِلَى الرَّحْمٰنِ وَفْدًا اور کافر کا عمل اس کا استقبال کرے گا وہ انتہائی قبیح صورت اور بدبودار ہوگا، وہ کہے گا: تو مجھے جانتا ہے؟ وہ کہے گا: نہیں مگر اللہ تعالیٰ نے تیری شکل قبیح بنائی ہے اور بُو بڑی کریہہ ہے۔ وہ کہے گا: میں دنیا میں اسی طرح تھا۔ میں تیرا بُرا عمل ہوں کبھی دنیا میں تو مجھ پر سوار تھا آج میں تجھ پر سوار ہوں گا پھر یہ آیت تلاوت کی: وَهُمْ يَحْمِلُونَ أَوْزَارَهُمْ عَلَىٰ ظُهُورِهِمْ (الانعام: 31) یہ حدیث سند کے اعتبار سے صحیح نہیں، یہ ابن عربی نے سراج المریدین میں کہا ہے اور اس حدیث کو ابو نصر عبد الرحیم بن عبد الکریم قشیری نے اپنی تفسیر میں ذکر کیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے جو گھوڑے پر سوار ہونا پسند کرے گا وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں گھوڑے پر سوار ہو کر حاضر ہوگا جو نہ لید کرے گا اور نہ پیشاب کرے گا، اس کی لگام سرخ یاقوت اور سبز زبرجد اور سفید موتیوں سے ہوگی اور اس کی زین سندس اور استبرق (ریشم) کی ہوگی اور جو اونٹ پر سوار ہونا پسند کرتا ہوگا وہ اونٹ پر سوار ہو کر جائے گا جو نہ مینگنیاں کرتا ہوگا اور نہ پیشاب کرتا ہوگا اس کی مہار یاقوت اور زبرجد سے ہوگی اور جو کشتی پر سوار ہونا پسند کرتا ہوگا وہ زبرجد اور یاقوت کی کشتی پر سوار ہوگا وہ غرق ہونے سے امن میں ہوں گے اور پریشانیوں سے امن میں ہوں گے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت علی

1۔ صحیح بخاری، کتاب الایمان والنذور، نیۃ فی الایمان، جلد 2، صفحہ 910

بنی اللہ نے عرض کی: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم میں نے بادشاہ اور ان کے وفود دیکھے ہیں اور میں نے ہر وفد سوار دیکھا ہے پس اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں جانے والے کیسے ہوں گے؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ نہ اپنے قدموں پر چلائے جائیں گے اور نہ انہیں ہانکا جائے گا بلکہ انہیں جنت کی اونٹنیوں میں سے دی جائیں گی جن کی مثل مخلوق نے پہلے نہ دیکھی ہوگی ان کے پالان سونے کے ہوں گے اور ان کی مہاریں زبرجد کی ہوں گی اور ان پر سوار ہوں گے حتی کہ وہ جنت کا دروازہ کھٹکھٹائیں گے''(1)۔ حضرت علی شیر خدا سے مروی ثعلبی کے الفاظ اس خبر میں زیادہ واضح ہیں۔ حضرت علی بنی اللہ نے فرمایا: جب یہ آیت نازل ہوئی تو میں نے عرض کی: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم میں نے بادشاہ اور ان کے وفد دیکھے ہیں میں نے کوئی وفد نہیں دیکھا مگر وہ سوار تھا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے علی! جب اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں لوٹنا ہوگا تو فرشتے مومنین سے ایسی سفید اونٹنیوں کے ساتھ ملیں گے جن کے پالان اور نکیلیں سونے کی ہوں گی ہر سواری پر ایک حلہ ہوگا دنیا جس کے مساوی نہ ہوگی، ہر مومن ایک لباس پہنے گا پھر ان کے ساتھ ان کی سواریاں چلیں گی پھر وہ اونٹنیاں انہیں لیکر چلیں گی حتی کہ وہ انہیں جنت تک پہنچا دیں گی۔ پھر انہیں فرشتے ملیں گے اور کہیں گے: سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِيْنَ ۞ (الزمر)

میں کہتا ہوں: یہ خبر نص ہے کہ وہ نہ سوار ہوں گے اور نہ لباس پہنیں گے مگر موقف سے۔ اور جب قبور سے باہر نکلیں گے پیدل چلتے ہوں گے ننگے پاؤں اور ننگے بدن ہوں گے اور غیر مختون ہوں گے، اسی حالت میں موقف کی طرف جائیں گے۔ اس کی دلیل حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں نصیحت کرنے کے لیے کھڑے ہوئے اور کہا: ''اے لوگو! تم اللہ کی بارگاہ میں جمع کیے جاؤ گے جبکہ ننگے پاؤں، برہنہ بدن اور غیر مختون ہو گے''۔ اس حدیث کو بخاری و مسلم نے تخریج کیا ہے۔ یہ مکمل سورۃ المومنون میں آئے گی ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اسی مفہوم کی حضرت عبداللہ بن انیس کی حدیث سورۂ آل عمران میں گزر چکی ہے۔ یہ کوئی بعید نہیں کہ دونوں حالتیں سعداء کی ہوں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث مخصوص ہو۔ حضرت ابوہریرہ بنی اللہ نے کہا: وفدا یعنی اونٹوں پر سوار ہو کر۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: وہ سوار ہوں گے انہیں جنت کی اونٹنیاں دی جائیں گے ان پر سونے کے کجاوے ہوں گے اور ان کی زینیں اور ان کی مہاریں زبرجد کی ہوں گی پس ان پر سوار کر کے انہیں جمع کیا جائے گا۔ حضرت علی بنی اللہ نے فرمایا: اللہ کی قسم! وہ پیدل جمع نہ کیے جائیں گے بلکہ وہ اونٹنیوں پر سوار ہوں گے جن کے کجاوے سونے کے ہوں گے ان کی زینیں یواقیت کی ہوں گی اگر وہ ارادہ کریں گے تو وہ چل پڑیں گی اور جب وہ انہیں حرکت دیں گے تو وہ اڑ پڑیں گی۔

بعض علماء نے فرمایا: وہ جو پسند کریں گے اس پر سوار ہو کر آئیں گے اونٹ یا گھوڑے یا کشتیاں جیسا کہ پہلے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے گزر چکا ہے۔ واللہ اعلم۔ بعض علماء نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وفدا کیونکہ وفود کی شان عربوں کے نزدیک یہ ہوتی ہے کہ وہ بشارات کے ساتھ آتے ہیں، وہ انعامات کا انتظار کرتے ہیں پس متقین عطا اور ثواب کا انتظار کریں گے۔ وَّنَسُوْقُ الْمُجْرِمِيْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ وِرْدًا، السوق کا معنی ہے چلنے پر ابھارنا، ورد کا معنی ہے پیاسے؛ یہ حضرت ابن عباس

1۔ تفسیر ابن کثیر، سورۂ مریم، جلد 2، صفحہ 466-465

کا قول ہے۔ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور حسن کا قول ہے۔ اخفش، فراء اور ابن اعرابی نے کہا: اس کا مطلب ہے وہ برہنہ پا ہوں گے اور پیدل ہوں گے۔ بعض نے فرمایا: اس کا معنی ہے وہ گروہوں کی شکل میں ہوں گے۔ ازہری نے کہا: اس کا معنی ہے وہ پیدل اور پیاسے ہوں گے جیسے اونٹ پانی پر وارد ہوتا ہے تو کہا جاتا ہے: جاء ورد بني فلان (فلاں قبیلہ کے اونٹ پانی پر آئے) اور قشیری نے کہا: وردا کا قول پیاس پر دلالت کرتا ہے کیونکہ پانی عام طور پر پیاس کے لیے لایا جاتا ہے۔ اور تفسیر میں ہے اس کا معنی ہے وہ پیدل ہوں گے پیاسے ہوں گے تاکہ ان کی گردنیں پیاس کی وجہ سے کٹ جائیں۔ جب مجرموں کو دوزخ کی طرف ہانکا جائے گا تو متقین کو جنت کی طرف لے جایا جائے گا۔ بعض علماء نے فرمایا: وردا اس کا معنی ہے الورود جیسے تیرا قول ہے: جئتك اکراما لك یعنی لا کرامك، اس کا معنی ہے نسوقهم لورود النار ہم انہیں آگ پر وارد کرنے کے لیے ہانکیں گے۔

میں کہتا ہوں: ان اقوال میں کوئی تضاد نہیں۔ انہیں پیاسے، برہنہ پا پیدل گروہوں کی شکل میں ہانکا جائے گا۔ ابن عرفہ نے کہا: الورود سے مراد وہ قوم ہے جو پانی پر وارد ہوتی ہے۔ پیاسوں کو وردا کہا جاتا ہے، کیونکہ وہ پانی پر ورود طلب کرتے ہیں جیسے تو کہتا ہے: قوم صوم یعنی روزے دار لوگ۔ قوم زور زیارت کرنے والے لوگ۔ یہ مصدر کے لفظ پر اسم ہے اس کا واحد وارد ہے۔ الورد اس جماعت کو بھی کہتے ہیں جو پانی پر وارد ہوتی ہے خواہ وہ پرندے ہوں یا اونٹ ہوں۔ الورد اس پانی کو بھی کہتے ہیں جس کے لیے ورود ہوتا ہے اور یہ کسی چیز سے کسی چیز کے ساتھ اشارہ کرنے کے باب سے ہے۔ الورد قرآن کے جز کو بھی کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے: قرأت وردي، الورد بخار کے دن کو کہتے ہیں جب وہ کسی کو مخصوص وقت پر ہوتا ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ یہ لفظ مشترک ہے۔ شاعر نے کہا وہ کنویں کا وصف بیان کرتا ہے:

يَطْمو إذا الوِرْدُ عليه التَكَّا (یعنی وہ لوگ جو پانی پر وارد ہوتے ہیں)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَا يَمْلِكُونَ الشَّفَاعَةَ، یعنی یہ کفار کسی کے لیے شفاعت کے مالک نہیں۔ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ﴿۸۷﴾ اس سے مراد مسلمان ہیں جو شفاعت کے مالک ہوں گے۔ یہ کسی چیز کا استثناء غیر جنس سے ہے یعنی لیکن وہ جنہوں نے خداوند رحمٰن سے کوئی وعدہ لیا ہے وہ شفاعت کریں گے۔ مَنْ اس بنا پر محل نصب میں ہے۔ بعض نے فرمایا: یملکون کی واو سے بدل کی بنا پر محل رفع میں ہے یعنی کوئی اللہ کی بارگاہ میں شفاعت کا مالک نہیں ہوگا مگر جس نے اللہ کی بارگاہ میں عہد لیا وہ مالک ہوگا اس بنا پر استثنا متصل ہوگا اور نَسُوْقُ الْمُجْرِمِيْنَ میں الْمُجْرِمِيْنَ سے کفار اور نافرمان سب مراد ہیں۔ پھر خبر دی کہ وہ شفاعت کے مالک نہ ہوں گے مگر گنہگار مومنین وہ شفاعت کے مالک ہوں گے کہ ان کی شفاعت قبول کی جائے گی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”میں شفاعت کرتا رہوں گا حتی کہ میں کہوں گا: یارب! میری شفاعت ان کے حق میں قبول فرما جنہوں نے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کہا، اللہ تعالیٰ فرمائے گا: اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! یہ تمہارے لیے نہیں بلکہ یہ میرے لیے ہے“ (1)۔ مسلم نے اس حدیث کا مفہوم نقل کیا ہے۔ یہ پہلے گزر چکی ہے۔ اخبار متفق ہیں کہ اہل علم اور اہل فضل

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، أدنى أهل الجنة منزلة فيها، جلد 1، صفحہ 110

شفاعت کریں گے اور ان کی شفاعت قبول کی جائے گی۔ پہلے قول پر کلام ہے، وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّيَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا ﴿۸۱﴾ سے متصل ہوگی۔ قیامت کے روز بتوں کے پجاریوں کی شفاعت کسی کے حق میں قبول نہ ہوگی اور نہ بتوں کی شفاعت کسی کے لیے ہوگی اور نہ وہ کسی کی شفاعت کا اختیار رکھتے ہوں گے یعنی شفاعت انہیں فائدہ نہ دے گی جیسا کہ فرمایا: فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشّٰفِعِيْنَ ﴿۴۸﴾ (المدثر)

بعض علماء نے فرمایا: اس کا مطلب ہے ہم متقین اور مجرمین کو جمع کریں گے کوئی شفاعت کا اختیار نہ رکھتا ہوگا مگر جس نے خداوند رحمٰن سے عہد لیا ہوگا یعنی اللہ تعالیٰ نے جس کو شفاعت کا اذن دیا ہوگا جیسے فرمایا: مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ (البقرہ:255) اور یہ وہ عہد ہے جس کے بارے فرمایا: اَمِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ﴿۷۸﴾ یہ لفظ ایمان اور ان اعمال صالحہ کا جامع ہے جن کے ذریعے انسان شفاعت کے مفہوم پر پہنچتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: العہد سے مراد لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ہے۔ مقاتل اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: کوئی شفاعت نہیں کرے گا مگر جس نے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہا اور اپنی ہر قوت و طاقت سے براءت کر کے اللہ تعالیٰ کی قوت و طاقت پر بھروسہ کیا وہ امید نہیں رکھتا مگر اللہ تعالیٰ سے۔ حضرت ابن مسعود نے فرمایا: میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے صحابہ سے یہ کہتے ہوئے سنا: ''کیا تم میں سے کوئی عاجز ہے کہ وہ ہر صبح و شام اللہ کی بارگاہ سے عہد کرے'' عرض کی گئی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم وہ کیا ہے فرمایا: ''وہ ہر صبح و شام کہے: اللّٰهم فاطر السموات والأرض عالم الغيب والشهادة إني أعهد إليك في هذه الحياة الدنيا بأني أشهد أن لا إله إلا أنت وحدك لا شريك لك وأن محمدا عبدك ورسولك فلا تكلني إلى نفسي فإنك إن تكلني إلى نفسي تباعدني من الخير وتقربني من الشر وأني لا أثق إلا برحمتك فاجعل لي عندك عهدا توفينيه يوم القيامة إنك لا تخلف الميعاد۔

جب آدمی یہ کہے گا تو اللہ تعالیٰ اس پر مہر لگا دے گا اور اسے عرش کے نیچے رکھ دے گا جب قیامت کا دن ہوگا تو ندا دینے والا ندا دے گا: کہاں ہیں وہ لوگ جن کے لیے اللہ کی بارگاہ میں عہد ہے؟ پس وہ کھڑا ہوگا اور جنت میں داخل ہوگا (1)۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا ﴿۸۸﴾ لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْـًٔا اِدًّا ﴿۸۹﴾ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ﴿۹۰﴾ اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا ﴿۹۱﴾ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لِلرَّحْمٰنِ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا ﴿۹۲﴾ اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ﴿۹۳﴾ لَقَدْ اَحْصٰىهُمْ وَعَدَّهُمْ عَدًّا ﴿۹۴﴾ وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا ﴿۹۵﴾

''اور کفار کہتے ہیں: بنا لیا رحمٰن نے (فلاں کو اپنا) بیٹا۔ (اے کافرو!) یقیناً تم نے ایسی بات کی ہے جو سخت معیوب ہے۔ قریب ہے آسمان شق ہو جائیں اس (خرافات) سے اور زمین پھٹ جائے اور پہاڑ گر پڑیں لرزتے ہوئے، کیونکہ وہ کہہ رہے ہیں کہ رحمٰن کا بیٹا ہے۔ اور نہیں جائز رحمٰن کے لیے کہ وہ بنائے کسی کو (اپنا) فرزند۔ کوئی ایسی چیز

1۔ تفسیر کشاف، زیر آیت ہذہ

نہیں جو آسمانوں اور زمین میں ہے مگر وہ حاضر ہوگی رحمٰن کی بارگاہ میں بندہ بن کر۔ اللہ تعالیٰ نے ان سب کا شمار کر رکھا ہے اور انہیں گن لیا ہے اچھی طرح۔ وہ سب پیش ہوں گے اس کے سامنے قیامت کے دن تنہا''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ قَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا۝ یعنی یہود و نصاریٰ اور جنہوں نے کہا: ملائکہ اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ یحییٰ، اعمش، حمزہ، کسائی، عاصم اور خلف نے وُلْداً واوٗ کے ضمہ اور لام کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ چار مقامات پر ایسا ہی پڑھا ہے۔ اس سورہ میں لَاُوْتَيَنَّ مَالًا وَّ وَلَدًا۝ یہ گزر چکا ہے اور یہ ارشاد: اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا۝ وَ مَا يَنْۢبَغِيْ لِلرَّحْمٰنِ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا۝ اور سورہ نوح میں مالہ وولدہٗ، سورۂ نوح میں ابن کثیر، مجاہد، حمید، ابوعمرو اور یعقوب نے ان کی موافقت کی ہے اور باقی قراء نے تمام جگہ واو اور لام میں فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے یہ دونوں لغتیں ہیں جیسے اَلعَرب والعُرْب، العَجَم والعُجْم۔ شاعر نے کہا:

ولقد رأیت معاشرا قد ثمّروا مالًا وَوُلْدًا

دوسرے شاعر نے کہا:

ولیتَ فلانًا کان فی بطنِ اُمّہٖ ولیت فلانا کان وُلْد حمار

اس کے مفہوم میں نابغہ نے کہا:

مَہلًا فداءٌ لکَ الأقوامُ کلّھم وما أُثَمِّر من مالٍ ومن وَلَدِ

پس اس نے فتحہ دیا۔ قیس جمع میں واو پر ضمہ اور مفرد میں واو پر فتحہ دیتے ہیں۔ جوہری نے کہا: الوَلَد کبھی واحد ہوتا ہے اور کبھی جمع ہوتا ہے اسی طرح الوِلد ضمہ کے ساتھ ہے۔ بنی اسد کی امثال سے وُلْدُکِ من دَمّٰی عقبیکِ اور کبھی الوَلد کی جمع الوُلد ہوتا ہے جیسے اُسْد جمع ہے اَسَد کی اور الوِلد واوٗ کے کسرہ کے ساتھ الوُلد میں ایک لغت ہے۔ نحاس نے کہا: ابوعبید نے ان کے درمیان فرق کیا ہے۔ اس نے کہا: الوَلَد اہل کے لیے ہوتا ہے اور الولد تمام کے لیے ہوتا ہے۔ ابوجعفر نے کہا: یہ قول مردود ہے، اہل لغت میں سے کوئی اسے نہیں جانتا۔ الوَلد اور الوُلد دونوں آدمی کی اولاد اور اولاد کی اولاد کے لیے ہوتے ہیں۔ وَلَد اکلام عرب میں اکثر ہوتا ہے؛ جیسے شاعر نے کہا:

مَہلًا فداء لَکَ الأقوامُ کلّھم وما أُثَمِّر مِنْ مالٍ ومن وَلَدِ

ابوجعفر نے کہا: میں نے محمد بن ولید کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے وُلْد کا وَلَد کی جمع ہونا جائز ہے، جیسے کہا جاتا ہے: وَثَنٌ وَوُثْن۔ اَسَد واُسْدٌ۔ ولد اور وُلد کا ہم معنی ہونا بھی جائز ہے، جیسے کہا جاتا ہے: عجم وعُجم، عَرب وعُربٌ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْـًٔا اِدًّا۝ ، ادًّا کا مطلب ہے سخت ممنوع اور قبیح چیز، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، مجاہد وغیرہما سے مروی ہے۔ جوہری نے کہا: الادّ، الادۃ الداھیۃ والامر العظیم۔ اس کا معنی ہے ہولناک اور سخت ترین امر ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْـًٔا اِدًّا اسی طرح الآدّ، مثل فاعل ہے اور الادۃ کی جمع اِدَدٌ، ہے أَدَّت فلانا داھیۃٌ تؤدُّہ أدًّا، فلاں کو سخت شدت نے آلیا۔ الادّ کا معنی غلبہ اور قوت بھی ہے۔ زجاج نے کہا:

نَغْزُوْنَ عَنِّیْ شِدَّۃً وَاَدًّا مِنْ بَعْدِ مَاکُنْتُ صُمُلًّا جَلْدًا

ابوعبدالرحمٰن سلمی نے کہا: اَدًّا ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے جب کوئی انتہائی ناپسندیدہ کام کرے۔ راجز نے کہا:

قد لقی الأقران منی نُکْرًا داهیة دهیاء إدًّا إمْرًا(1)

نحاس کے علاوہ سے مروی ہے ثعلبی نے کہا: اس میں تین لغات ہیں۔ اِدًّا ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ، یہ قرأت عامۃ ہے۔ أَدًّا ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ، یہ سلمی کی قرات ہے۔ اور آدّ مثل مادّ یہ بعض عربوں کی لغت ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ابوالعالیہ سے بھی مروی ہے گویا یہ الثقل کے معنی سے ماخوذ ہے۔ کہا جاتا ہے: أدّہ الحمل یؤدہ اَدًّا، بوجھ نے اسے بوجھل کر دیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تَكَادُ السَّمٰوٰتُ یہاں اور سورۃ الشوریٰ میں قرأت عامہ تاء کے ساتھ ہے۔ نافع، یحییٰ اور کسائی کی قرأت یکاد یاء کے ساتھ ہے کیونکہ فعل مقدم ہے۔ یَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ، یعنی اس سے پھٹ جائیں۔ نافع، ابن کثیر اور حفص وغیرہم نے یا کے بعد تا اور طا کی شد کے ساتھ پڑھا ہے، یہاں بھی اور سورۃ الشوریٰ میں التفطر سے مشتق کیا ہے۔ حمزہ اور ابن عامر نے سورۃ الشوریٰ میں ان کی موافقت کی ہے اور یہاں الانفطار سے مشتق ینفطرن پڑھا ہے اسی طرح ابوعمرو، ابوبکر اور مفضل نے دونوں سورتوں میں انفطار سے مشتق پڑھا ہے؛ اور یہی ابوعبید کا اختیار ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ ۝ (الانفطار) السَّمَآءُ مُنْفَطِرٌۢ بِهٖ (المزمل: 18) اور اللہ کا ارشاد ہے: وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ یعنی زمین پھٹ جائے گی۔ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس کا معنی ہے ھدما یعنی سخت آواز کے ساتھ پہاڑ گریں گے۔ حدیث شریف میں ہے: اللّٰھم إنی أعوذبك من الھد والھدۃ، اے اللہ! میں ھد اور الھدۃ سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔ شمر نے کہا: احمد بن غیاث مروزی نے کہا: الھد کا معنی گرنا ہے اور الھدۃ کا معنی زمین میں دھنسنا ہے۔ اللیث نے کہا: الھد سے مراد سخت گرنا ہے جیسے دیوار یکبارگی گرتی ہے۔ کہا جاتا ہے: ھدّنی الأمر وھدّ رکنی، یعنی اس نے مجھے توڑ دیا اور مجھ پر بہت اثر کیا؛ یہ ہروی کا قول ہے۔ جوہری نے کہا: ھدّ البناء یھدہ ھدا یعنی اس نے دیوار کو توڑ دیا ہلا دیا۔ ھدّتہ المصیبۃ، مصیبت نے اسے کمزور کر دیا، انھدّ الجبل پہاڑ ٹوٹ گیا۔ اصمعی نے کہا: الھدّ کمزور آدمی۔ جب کوئی شخص کسی کو دھمکی دیتا ہے تو کہتا ہے: إنی لغیرھدّ یعنی میں کمزور آدمی نہیں ہوں۔ ابن اعرابی نے کہا: الھدّ مردوں میں سے سخی آدمی۔ رہا بزدل کمزور آدمی تو اسے الھِدّ (ھاء کے کسرہ کے ساتھ) کہتے ہیں؛ شاعر نے کہا:

لَیْسُوا بِهِدِّیْنَ فِی الْحُرُوْبِ إِذَا تُعْقَدُ فَوقَ الْحَرَاقِفِ النُّطُقُ

الھدّ اس آواز کو کہتے ہیں جب دیوار گرتی ہے تو کہتا ہے: ھَدَّ یَھِدُّ ھَدِیدًا۔ الھاد اس آواز کو کہتے ہیں جس کو اہل ساحل سنتے ہیں جو دریا کی طرف سے آتی ہے اس کی زمین میں آواز ہوتی ہے۔ اسی سے بعض اوقات زلزلہ آتا ہے۔ دویہ اس کی آواز۔ نحاس نے کہا: ھدًّا مصدر ہے کیونکہ تخر کا معنی تھدّ ہے۔ دوسروں نے کہا: یہ حال ہے اور مھدودۃً کے معنی میں ہے۔ اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا، اَنْ فراء کے نزدیک محل نصب میں ہے۔ اس کا معنی ہے لأن دعوا اور من أن دعوا، حرف جر کو حذف

1۔ تفسیر طبری، جز 16، صفحہ 149

کر کے نصب دی گئی ہے۔ فراء اور کسائی نے کہا: یہ محل جر میں ہے اور حرف جر مقدر ہے۔ ابن المبارک نے ذکر کیا ہے کہ ہمیں مسعر نے بتایا انہوں نے واصل سے انہوں نے عون بن عبداللہ سے روایت کیا ہے فرمایا حضرت عبداللہ بن مسعود نے فرمایا: ایک پہاڑ دوسرے پہاڑ سے کہتا ہے: اے فلاں! کیا آج تیرے پاس سے کوئی اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والا گزرا ہے۔ اگر وہ ہاں کہتا ہے تو اسے اس سے خوشی ہوتی ہے پھر حضرت عبداللہ نے یہ آیت پڑھی۔ وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا ﴿۸۸﴾ فرمایا: کیا تو ان پہاڑوں کو دیکھتا ہے کہ یہ جھوٹ کو سنتے ہیں اور خیر کو نہیں سنتے؟ فرمایا: مجھے عوف نے بتایا انہوں نے غالب بن عجرد سے روایت کیا انہوں نے کہا مجھے شام کے شخص نے منیٰ کی مسجد میں بتایا اس نے کہا: اللہ تعالیٰ نے جب زمین کو پیدا کیا اور جو کچھ اس میں درخت ہیں انہیں پیدا کیا زمین میں کوئی درخت ایسا نہ تھا بنو آدم جس کے پاس آتے مگر وہ اس درخت سے منفعت پاتے ان کے لیے اس سے منفعت ہوتی زمین اور درخت اسی طرح تھے حتیٰ کہ بنی آدم کے کافروں نے یہ بڑا بول بولا کہ اللہ تعالیٰ نے بیٹا بنا لیا، جب انہوں نے یہ کہا، تو زمین کانپ گئی اور درختوں کے کانٹے نکل آئے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: پہاڑ اور تمام درخت کانپ گئے دریا، ان میں رہنے والی مچھلیاں کانپ گئیں اس وجہ سے مچھلیوں میں کانٹے ہو گئے اور درختوں میں کانٹے ہو گئے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ بھی فرمایا: اور حضرت کعب نے فرمایا آسمان، زمین، پہاڑ اور تمام مخلوق گھبرا گئی مگر جن وانس نہ ڈرے، قریب تھا کہ آسمان اور زمین زائل ہو جائے۔ فرشتے غصہ میں آئے اور جہنم بھڑک اٹھی اور درختوں کے کانٹے نکل آئے۔ زمین خشک اور بنجر ہو گئی جب لوگوں نے کہا: اتخذ اللہ ولدا، محمد بن کعب نے فرمایا: قریب تھا کہ اللہ کے دشمن ہم پر قیامت برپا کر دیتے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ﴿۹۰﴾ اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا ﴿۹۱﴾۔ اور ابن عربی نے کہا(1): کعب نے سچ کہا کہ یہ قول ہی بہت بڑا ہے اس کے متعلق قضاء وقدر ہو چکی ہے۔ اگر یہ نہ ہوتا کہ اللہ تعالیٰ کو کسی کافر کا کفر کم مرتبہ نہیں کرتا اور کسی مومن کا ایمان اسے بلند نہیں کرتا اور اس کی ملک میں مومن کا ایمان اضافہ نہیں کرتا اسی طرح اس کی ملک سے کسی اعتبار سے کمی نہیں کرتا تو زبانوں پر ایسے کلمات جاری ہی نہ ہوتے۔ لیکن اللہ تعالیٰ قدوس، حکیم، حلیم ہے اس کے بعد وہ کافروں کے کسی قول کی کوئی پروا نہیں کرتا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا يَنْۢبَغِيْ لِلرَّحْمٰنِ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا ﴿۹۲﴾ اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا يَنْۢبَغِيْ لِلرَّحْمٰنِ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا ﴿۹۲﴾ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات سے بیٹے کی نفی کی کیونکہ بیٹا ہونا جنسیت اور حدوث کا تقاضا کرتا ہے جیسا کہ ہم نے سورۂ بقرہ میں بیان کیا یعنی اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق یہ نہیں اس کے ساتھ اس کا یہ وصف بیان کیا جا سکتا ہے اور نہ اس کے حق میں یہ جائز ہے کیونکہ بیٹا ہمیشہ والد سے ہوتا ہے پھر اس کا بھی والد اور اصل ہوتی ہے اللہ تعالیٰ اس سے پاک اور منزہ ہے۔ شاعر نے کہا:

فی رأس خلقاء من عنقاء مشرفة ما ینبغی دونها سھلٌ ولا جبلُ(2)

اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّاۤ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ﴿۹۳﴾۔ اِنْ نافیہ بمعنی ما ہے یعنی آسمانوں اور زمین میں کوئی ایسا

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1253
2۔ تفسیر طبری، جز 17، صفحہ 151

نہیں ہے مگر وہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کے لیے عبودیت کا اقرار کرنے والا ہوگا اور اس کی بارگاہ میں عجز و انکساری کرنے والا ہو گا جیسا کہ فرمایا: وَ كُلٌّ اَتَوْهُ دٰخِرِيْنَ۝ (النمل) یعنی تمام اس کی بارگاہ میں عجز و انکساری کا اظہار کرتے ہوئے آئیں گے ساری مخلوق اس کے غلام ہیں پھر اس مخلوق میں سے کون اس کا بیٹا ہوگا؟ اللہ تعالیٰ بلند و بالا ہے اس سے جو یہ کہتے ہیں اور جو کچھ یہ منکر بیان کرتے ہیں، اٰتِي لکھنے میں یاء کے ساتھ ہے اصل تنوین ہے۔ پس یہ استخفافاً حذف کی گئی ہے اور مضاف کیا گیا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ اس آیت میں دلیل ہے کہ بیٹا والد کے لیے مملوک نہ ہوگا بخلاف اس شخص کے جو کہتا ہے کہ وہ اسے خریدے گا اور مالک ہو جائے گا اور وہ اُس پر آزاد نہ ہوگا مگر جب وہ خود اسے آزاد کرے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اولاد ہونے اور ملک ہونے میں منافات ظاہر فرمائی ہے جب باپ بیٹے کا کسی اعتبار سے مالک ہوگا تو وہ اس پر آزاد ہو جائے گا اس دلیل کی وجہ اس آیت سے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ولدیت اور عبدیت کو تقابل کی دو طرفوں میں رکھا ہے ایک کی نفی سے دوسری کا اثبات ہوگا اگر دونوں جمع ہوتیں تو اس کے قول کا کوئی فائدہ حاصل نہ ہوتا جس کے ساتھ احتجاج واقع ہوتا۔ صحیح حدیث میں ہے "کوئی بیٹا اپنے والد کا حق ادا نہیں کر سکتا مگر وہ اسے مملوک پائے پھر اسے خریدے اور اسے آزاد کردے" (1)۔ جب باپ اپنے بیٹے کا مالک نہیں ہوتا حالانکہ باپ کو بیٹے پر ایک مرتبہ حاصل ہے تو بیٹا بدرجہ اولیٰ باپ کا مالک نہ ہوگا کیونکہ وہ مرتبہ میں اس سے کم ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ اسحاق بن راہویہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد: من اعتق شرکاً لہ فی عبدٍ، سے استدلال کیا ہے اس سے مراد مذکر غلام ہیں عورتیں نہیں ہیں۔ پس اس پر مکمل نہ ہوگا جس نے مؤنث میں سے اپنا حصہ آزاد کیا۔ یہ جمہور علماء سلف کے نظریہ کے خلاف ہے کیونکہ جمہور نے مذکر اور مونث میں فرق نہیں کیا ہے کیونکہ عبد کے لفظ سے جنس مراد ہوتی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اِلَّاۤ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا۝ یہ ارشاد مذکر، مونث تمام غلاموں کو شامل ہے۔ اور اسحاق نے دلیل پکڑی ہے کہ عبد کا مونث حکایت کیا گیا ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ بخاری نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے فرمایا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ابن آدم نے میری تکذیب کی ہے اسے یہ جائز نہیں تھا اور اس نے مجھے برا کہا حالانکہ یہ اس کو جائز نہ تھا اور رہا اس کا میری تکذیب کرنا تو اس کا یہ قول ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے دوبارہ پیدا نہیں کرے گا جس طرح پہلے کیا تھا جبکہ پہلی مرتبہ پیدا کرنا مجھ پر اس کے اعادہ سے آسان نہیں تھا اور اس کا مجھے گالی دینا یہ ہے کہ اس نے کہا: اللہ تعالیٰ نے بیٹا بنا لیا ہے حالانکہ میں یکتا ہوں، بے نیاز ہوں نہ اس نے کسی کو جنم دیا ہے اور نہ وہ جنم دیا گیا ہے۔ اور نہ میرا کوئی ہمسر ہے"۔(2) سورۂ بقرہ میں یہ گزر چکا ہے اس جیسی جگہ میں اس کا اعادہ بہتر ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَقَدْ اَحْصٰىهُمْ یعنی ان کی تعداد کا اسے علم ہے۔ وَ عَدَّهُمْ عَدًّا یہ تاکید کے لیے ہے یعنی اس پر ان میں سے کوئی مخفی نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں: اللہ تعالیٰ کے اسماء میں المحصی بھی ہے یعنی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں موجود ہے جس کو ترمذی

1۔ مسند احمد، حدیث نمبر 7143
2۔ مشکوٰۃ المصابیح کتاب الایمان الفصل الاول

نے نقل کیا ہے اس فعل کا اشتقاق بھی اس پر دلالت کر رہا ہے۔ استاذ ابو اسحاق اسفرائینی نے کہا: اسماء الٰہیہ میں سے المحصی بھی ہے اور یہ مختص ہے کہ کثرت اسے غافل نہیں کرتی جیسے نور کی روشنی اور ہوا کا تیز چلنا اور پتوں کا گرنا وغیرہ وہ ہر پتے میں حرکات کے اجزاء کو اس وقت جانتا ہے پھر وہ کیسے نہیں جانتا جبکہ اس نے سب کچھ پیدا کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ؕ وَهُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ (الملک)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی تفسیر میں ہے کہ: لَقَدْ اَحْصٰىهُمْ وَعَدَّهُمْ عَدًّا کا معنی یہ ہے کہ وہ ارادہ کرتا ہے کہ وہ اس کی عبودیت کا اقرار کریں اور اس کے لیے ربوبیت کی گواہی دیں گے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَكُلُّهُمْ اٰتِیْهِ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ فَرْدًا یعنی تنہا آئے گا اس کا کوئی مددگار نہ ہوگا اور نہ اس کے ساتھ مال ہوگا تاکہ وہ اس سے نفع حاصل کرے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یَوْمَ لَا یَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ۙ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ (الشعراء) پس اسے کوئی چیز نفع نہ دے گی مگر جو اس نے عمل آگے بھیجا ہوگا اور فرمایا: كُلُّهُمْ اٰتِیْهِ، یہ لفظ کل کے اعتبار سے ہے اور معنی کے اعتبار سے آتوہ ہے۔ قشیری نے کہا: اس میں اشارہ ہے کہ تم اپنے لیے پسند نہیں کرتے کہ تم اپنی اولادوں کو غلام بناؤ حالانکہ وہ سب غلام ہیں تو پھر تم اس کے لیے وہ کیسے پسند کرتے ہو جو تم اپنے لیے پسند نہیں کرتے؟ ان کی اس کی مثل میں رد فرمایا کہ وہ اپنے لیے بیٹیوں کو پسند نہیں کرتے اور وہ کہتے ہیں: فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس سے بلند و بالا ہے اور انہوں نے کہا: مورتیاں اللہ کی بیٹیاں ہیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَمَا كَانَ لِشُرَكَآىِٕهِمْ فَلَا یَصِلُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَمَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ یَصِلُ اِلٰى شُرَكَآىِٕهِمْ (الانعام:136)

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَیَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا

''بلاشبہ جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے پیدا فرمادے گا خدائے مہربان ان کے لیے (دلوں میں) محبت''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا، یعنی جنہوں نے تصدیق کی۔ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَیَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا یعنی اپنے بندوں کے دلوں میں محبت پیدا فرمادے گا جیسا کہ امام ترمذی نے حضرت سعد اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث روایت کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے محبت فرماتا ہے تو جبریل سے فرماتا ہے میں فلاں سے محبت کرتا ہوں تو بھی اس سے محبت کر''۔ فرمایا: ''پھر آسمان میں ندا دیتا ہے پھر اس کے لیے محبت کو اہل زمین میں اُتارتا ہے''۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد اسی کی طرف اشارہ کرتا ہے: سَیَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا ''اور جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کو ناپسند فرماتا ہے تو جبریل سے فرماتا ہے میں فلاں کو ناپسند کرتا ہوں پھر آسمان میں منادی کر دی جاتی ہے پھر اس کے لیے نفرت زمین میں اتاری جاتی ہے''۔ امام ترمذی نے فرمایا: یہ حدیث حسن صحیح ہے (1)۔ امام بخاری اور امام مسلم نے اس کا مفہوم ذکر کیا ہے۔ امام مالک نے موطا میں روایت کی ہے اور نوادر الاصول میں بھی مروی ہے، ابو بکر بن سابق اموی نے ہمیں بیان فرمایا انہوں نے کہا ہمیں ابو مالک جنبی نے بیان کیا انہوں نے جویبر سے انہوں نے ضحاک سے انہوں نے حضرت

1۔ جامع ترمذی، سورۂ مریم، جلد 2، صفحہ 145۔ ایضاً، حدیث نمبر 3085، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے فرمایا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ مومن کے لیے محبت، ملاحت اور الفت نیک لوگوں کے سینوں میں اور ملائکہ مقربین میں پیدا فرماتا ہے پھر یہ آیت پڑھی: اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَیَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا ۝ علماء کا اختلاف ہے کہ یہ کس کے بارے میں نازل ہوئی؟ بعض علماء نے فرمایا: یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ حضرت براء بن عازب نے روایت کیا ہے فرمایا نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ''اے علی تم یہ کہو: اللھم اجعل لی عندك عھدا واجعل لی فی قلوب المومنین مودۃ (1) (اے اللہ! میرے لیے اپنی بارگاہ سے عہد بنادے اور میرے لیے مومنین کے دلوں میں محبت ڈال دے) تو یہ آیت نازل ہوئی؛ یہ ثعلبی نے ذکر فرمایا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ عبدالرحمٰن بن عوف کے بارے میں نازل ہوئی، اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے بندوں کے دلوں میں محبت ڈال دی ہے انہیں کوئی مومن نہیں ملتا مگر وہ اس کی عزت کرتا تھا اور کوئی مشرک و منافق نہیں ملتا تھا مگر وہ ان کی تعظیم کرتا تھا۔ حرم بن حیان کہتے تھے: جب کوئی شخص اللہ کی بارگاہ میں سچے دل سے آتا ہے تو اللہ تعالیٰ اہل ایمان کے دلوں کو اس کی طرف متوجہ کردیتا ہے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ ان کی محبت و رحمت اسے عطا فرماتا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: قیامت کے روز اللہ تعالیٰ ان کے لیے مومنین کے دلوں میں اور فرشتوں میں محبت ڈال دے گا۔

میں کہتا ہوں: جب وہ دنیا میں محبوب تھا تو آخرت میں بھی محبوب ہوگا۔ اللہ تعالیٰ صرف مومن متقی سے محبت فرماتا ہے اور وہ پسند نہیں فرماتا مگر خالص متقی کو۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہمیں بھی ان نیک لوگوں سے کرے۔ امام مسلم نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے فرمایا نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ جب کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو جبریل کو بلاتا ہے اور فرماتا ہے میں فلاں سے محبت کرتا ہوں تو بھی اس سے محبت کر پس جبریل بھی اس سے محبت کرتا ہے پھر وہ آسمان میں منادی کرتا ہے اور کہتا ہے: اللہ تعالیٰ فلاں سے محبت کرتا ہے پس تم اس سے محبت کرو، پس آسمان والے اس سے محبت کرتے ہیں'' (2)۔ فرمایا: ''پھر اس کی قبولیت زمین میں رکھی جاتی ہے۔ اور جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے بغض کرتا ہے تو وہ جبریل کو بلاتا ہے اور کہتا ہے: میں فلاں بندے کو ناپسند کرتا ہوں تو بھی اسے ناپسند کر'' فرمایا'' پھر جبریل اسے ناپسند کرتا ہے۔ پھر وہ آسمان والوں میں منادی کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ فلاں کو ناپسند کرتا ہے تو بھی اسے ناپسند کر''۔ فرمایا: ''وہ اسے ناپسند کرتے ہیں پھر اس کی نفرت زمین میں رکھی جاتی ہے''۔

فَاِنَّمَا یَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِیْنَ وَ تُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا ۝

''صرف اس لیے ہم نے آسان کردیا ہے قرآن کو آپ کی زبان میں اُتار کر آپ مژدہ سنائیں اس سے پرہیزگاروں کو اور ڈرائیں اس کے ذریعے اس قوم کو جو بڑی جھگڑالو ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِنَّمَا یَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ یعنی ہم نے آپ کی عربی زبان میں قرآن کو بیان کیا اور ہم نے اسے غور و فکر

1۔ صحیح بخاری، کتاب التوحید، کلام الرب مع جبرائیل ونداء اللہ و ملائکۃ، جلد 2، صفحہ 115

2۔ صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ، إذا أحب اللہ عبدا أحبہ إلی عبادہ، جلد 2، صفحہ 231

کرنے والے پر آسان بنا دیا۔ بعض علماء نے فرمایا: ہم نے اسے تجھ پر عرب کی زبان میں نازل کیا تا کہ ان پر اس کا سمجھنا آسان ہو جائے۔ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِينَ یعنی اس کے ساتھ آپ مومنین کو بشارت دیں۔ وَتُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا ﴿۹۷﴾، اللد جمع ہے الالد کی سخت جھگڑالو آدمی؛ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: الدّ الخصام۔ شاعر نے کہا:

أبيت نجيا للهمومِ كأنني أخاصم أقواماً ذوی جدلٍ لدا

ابوعبیدہ نے کہا: الالد اسے کہتے ہیں جو حق کو قبول نہ کرتا ہو اور باطل کا دعویٰ کرتا ہو۔ حسن نے کہا: اللد حق سننے سے بہرا شخص۔ ربیع نے کہا: دلوں کے کان جن کے بہرے ہوں۔ مجاہد نے کہا: اس سے مجاز ہے (1)۔ ضحاک نے کہا: باطل میں جھگڑنے والے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: جھگڑے میں سختی کرنے والے۔ بعض نے فرمایا: ظالم وہ ہوتا ہے جو سیدھا نہیں ہوتا۔ سب مفہوم ایک جیسے ہیں۔ یہ لوگ خاص کیے گئے ہیں انذار کے لیے جس کے پاس عناد نہیں ہوتا اس کا مطیع ہونا آسان ہوتا ہے۔

وَ كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ ۭ هَلْ تُحِسُّ مِنْهُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَوْ تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْزًا ﴿۹۸﴾

''اور کتنی قومیں تھیں جن کو ہم نے ہلاک کر دیا ان سے پہلے کیا محسوس کرتے ہو ان میں کسی کو یا سنتے ہوں ان کی کوئی آہٹ''

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ قرن سے مراد امت ہے اور جماعت ہے۔ اللہ تعالیٰ اہل مکہ کو ڈرا رہا ہے۔ هَلْ تُحِسُّ مِنْهُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَوْ تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْزًا ﴿۹۸﴾ احد محل نصب میں ہے یعنی هل ترىٰ منهم أحداً وتجد کیا ان میں سے کسی کو آپ دیکھتے ہیں۔ اَوْ تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْزًا یا ان کے لیے کوئی آواز سنتے ہیں؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ سے مروی ہے یعنی وہ مر چکے ہیں اور اپنے اعمال پر اجر حاصل کر چکے ہیں۔ بعض نے فرمایا: الرکز وہ آواز یا حرکت جو سمجھی نہ جا سکے یہ یزیدی اور ابوعبیدہ کا قول ہے جیسے رکز الکتیبة، لشکر کی آہٹ۔ ابوعبیدہ نے لبید کا شعر بطور استشہاد لکھا ہے:

وَتَوَجَّسَتْ رِكْزَ الأنيس فراعها عن ظَهْرِ غيبٍ والأنيس سَقَامُها

بعض نے فرمایا: اس سے مراد مخفی آواز ہے، اس سے رکز الرمح بولا جاتا ہے جب نیزے کی ایک طرف زمین میں غیب ہو جائے۔ طرفہ نے کہا:

وَصَادِقَتَا سَمْعِ التَّوَجُّسِ للسُّرٰى لِرِكْزٍ خَفِيٍّ أو لِصَوْتٍ مُنَدَّدِ

اور ذوالرمۃ ایک بیل کی تعریف کرتا ہے جو شکاری اور کتوں کی آواز سنتا ہے:

إذا توجّسَ رِكْزًا مقفرٌ نَدِسٌ بِنبأةِ الصوتِ مافی سمعه كذب

یعنی اس کے سننے میں جھوٹ نہیں یعنی وہ سننے میں سچا ہے۔ الندس ماہر کو کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے: ندِس وندُس جیسے کہا جاتا ہے: حذِرٌ وحذُرٌ، ويقِظٌ يقُظٌ، النبأة، آہستہ آواز۔ اسی طرح الرکز ہے اور الرکاز اس مال کو کہتے ہیں جو دفن کیا گیا ہو؛ واللہ اعلم بالصواب۔

1۔ تفسیر طبری، جز 16-15، صفحہ 154